رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔
ضخامت ۶۰۲ صفحات، مجلد نو روپیہ ۹ لعہ، علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور دہان ہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا۔ توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ۔
ضخامت ۴۶۲ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے
قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کیساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے روک تھام میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

آئندہ سالنامہ کا اعلان صفحہ ۴ پر ملاحظہ فرمائیے

چونکہ رجسٹری کی فیس اب زیادہ ہوگئی ہے اس لئے "نگار" کا سالانہ وی پی اب آٹھ روپیہ سات آنے میں روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۳ — فہرست مضامین مئی سنہ ۱۹۵۳ء — شمارہ ۵

ملاحظات ---- اڈیٹر ---- ۱
اسلامی تہذیب و ثقافت ---- ڈاکٹر سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی) ۶
ہندوستان کا ایک گمنام شاعر قلق میرٹھی ---- تمکین کاظمی ---- ۱۲
اسٹالین اور ویلز کی تاریخی ملاقات ---- اڈیٹر ---- ۱۸
ایک سچا دوست ---- آنسہ عایشہ (ام - اے) ---- ۲۶
زندگی کی ابتداء اور اس کا عروج ---- محمود علی خاں ---- ۳۲
صوبۂ بہار میں غالب کی مقبولیت ---- فصیح الدین بلخی ---- ۴۰
اذا جاءت الساعۃ وانشق القمر ---- اڈیٹر ---- ۴۶
منظومات { رضا نقوی - ساقی جاوید - فضا ابن فیضی - جمیل مظہری - جگر بریلوی - وحید اختر - شمیم نعمانی - شفیق - انو ... لوی - رئیس امروہوی - رضا نقوی - افتخار اعظمی انور } ۵۴
مطبوعات موصولہ ---- ۵۵

(داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہوگیا اور جون کا پرچہ ذریعہ وی پی آٹھ روپیہ سات آنے میں روانہ ہوگا۔ آپ کا فایدہ اسی میں ہے کہ چندہ آٹھ روپیہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کریں)

ملاحظات

انقلاب پاکستان

پچھلے ایک سال کے اندر پاکستان میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا تھا وہ سیاسی و معاشی، مذہبی و ذہنی ہر حیثیت سے حد درجہ افسوسناک تھا اور مجھے یقین تھا کہ "ناظم الدین وزارت" اگر آئینی طور پر ختم نہ ہوئی تو وہ غیر آئینی طور پر ختم کردی جائے گی، اس لئے جس دن انقلاب وزارت کی خبر میں نے سنی تو مجھے خوشی ہوئی اور تھوڑی سی حیرت بھی، خوشی اس لئے کہ انقلاب محض خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو، بہر حال زندگی کا ثبوت ہے اور حیرت اس لئے کہ مسٹر غلام محمد گورنر جنرل نے جو عرصہ سے ناظم الدین وزارت کی ناکامی کو محسوس کر رہے تھے اور اس احساس کی بنا پر بارہا خواجہ صاحب کو مستقبل کی طرف سے متنبہ کر چکے تھے، اب کیوں دفعتاً وہ قدم اُٹھایا جو اس سے پہلے ہی انھیں اُٹھانا چاہئے تھا لیکن خیر — بہر حال اندرونی طور پر جو اسباب بھی اس فوری انقلاب کے ہوں یہ بڑی دل خوش کن خبر تھی نہ صرف اہل پاکستان کے لئے بلکہ ہم لوگوں کے لئے بھی، جو پاکستان سے بہت قریب کا تعلق رکھتے ہیں۔

اس وقت پاکستان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اقتصادی عدم توازن کا ہے اور اسی کو سلجھانا حکومت کا فرض اولین ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا محض وزارت کا انقلاب اس دشواری کے دور کرنے کے لئے کافی ہے۔ کیا مسٹر محمد علی دفعتاً ملک کی اس ذہنیت کو بدل دیں گے جو غلط لیڈرشپ کی وجہ سے وہاں کے طبقۂ خواص و عوام میں پیدا ہوگئی ہے اور کیا بغیر معاشی نظام کو بدلے ہوئے اُس طبقاتی نشیب و فراز کو دور کیا جاسکتا ہے جو اس وقت پاکستان میں پایا جاتا ہے اور جس کو دور کئے بغیر کبھی کوئی ملک نہ ترقی کرسکتا ہے نہ سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرسکتا ہے؟

ہوسکتا ہے کہ مسٹر محمد علی اس وقت امریکہ سے لاکھوں ٹن غلّہ حاصل کرکے لوگوں کو فاقہ کی مصیبت میں مبتلا نہ ہونے دیں، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ حکومت کے بڑھتے ہوئے غیر ضروری مصارف میں کمی کرکے اپنے میزانیہ کو اعتدال پر لاسکیں اور یہ بھی دشوار نہیں کہ وہ ملازم کو کچھ دنوں تک سر نہ اُٹھانے دیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جسے ہم اصلاح و ترقی کی بنیاد یا اساس کہہ سکیں۔ یہ سب عارضی و وقتی تدبیریں ہیں جن سے مرض کچھ دنوں کے لئے دب تو سکتا ہے لیکن دور نہیں ہوسکتا۔

پاکستان کا "نعرۂ عمل" جو اکثر وہاں کے ریڈیو سے سننے میں آتا ہے، الفاظ سہ گانہ پر مشتمل ہے۔ اتحاد۔ یقین اور سعی پیہم۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی بلند تعلیم ہے، لیکن افسوس ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد سے اس وقت تک ان میں سے کوئی بات عملی صورت سے ہمارے سامنے نہیں آئی، بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ جتنا زیادہ ان باتوں کا ذکر کیا گیا، عملاً ان سے اتنا ہی زیادہ بُعد ہوتا گیا۔

سب سے پہلی شرط تنظیم و اتحاد ہے، کیونکہ اس کے بغیر نہ کوئی اجتماعی جد و جہد ہوسکتی ہے نہ اپنے اندر خود اعتمادی و یقین کی کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے اور بدقسمتی سے یہی چیز پاکستان میں اب تک پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہاں جو صوبائی اختلاف و تنافر اس وقت پایا جاتا ہے وہ تقسیم ہند سے پہلے نہیں پایا جاتا تھا۔

یقیناً اس کا کوئی سبب ہونا چاہئے اور جب تک اس کو دور نہ کیا جائے کامیابی دشوار ہے۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ پاکستان اس وقت تک کوئی ایسا نصب العین متعین نہیں کرسکا ہے، جو موجودہ دنیا کے تقاضہ کو پورا کرنے والا ہو۔

اولین اساسی غلطی جس پر پاکستان کی بنیاد قایم کی گئی ہے دو قومی نظریہ نہ تھا، بلکہ تفریق کفر و اسلام تھی، جس نے عام طور پر وہاں کے لوگوں میں مذہبی جذبہ پیدا کرکے، انھیں یہ یقین کرلینے کا موقع دیا کہ پاکستان کی حکومت خالص مذہبی حکومت ہوگی۔

یہی تھی وہ پہلی بنیادی اینٹ جو ٹیڑھی رکھی گئی اور اسی پر پاکستان کی تعمیر شروع ہوئی جس کو قدرتاً کج ہونا چاہئے تھا۔ اس سے دو بہت بڑے نقصان ہوئے، ایک یہ کہ پاکستان کے قیام کے بعد جو نیا جوش و ولولہ وہاں کی آبادی میں پیدا ہوا تھا، وہ بجائے اسکے کہ ملک کی اصلاح و تعمیر میں صرف ہوتا، ایک جھوٹے مذہبی افتخار کی پرورش میں صرف ہونے لگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی جو ہمیشہ ایسے ہی موقع کا منتظر رہتا ہے سامنے آگیا۔ پھر مسجدیں تو اس نے بہت سی تعمیر کرادیں لیکن نمازی نہ پیدا کرسکا، قرون اُولیٰ کی اسلامی معیشت و معاشرت کو زندہ کرنے کا پیام تو اس نے دیا لیکن اس پیام پر عمل خود اس نے بھی کبھی نہ کیا، آخرکار مسلمان جو یوں بھی سہل انگار واقع ہوئے ہیں ان کی ذہنیت بالکل ٹھٹھر کر رہ گئی اور خدا تو خیر انھیں کیا ملتا "وصال صنم" بھی نصیب نہ ہوا، خوشحالی کا کیا ذکر روزی تک کے لالے پڑ گئے۔

دوسرا نقصان مذہبی حکومت کے تصور سے یہ ہوا کہ پاکستان نے اپنے اور ہندوستان کے درمیان ایک سنگین دیوار حایل کردی اور اخلاق و انسانیت کے تصور کو پس پشت ڈال دیا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے مسایل میں ہندوستان نے بھی انتہائی تنگ نظری سے کام لیا اور یہاں کی غالب آبادی کی نگاہ میں پاکستان اب بھی کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے لیکن حکومت کی متعینہ پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ عوام سے ہے برخلاف اس کے پاکستان نے یہ یقین دلا کر کہ اس کا آئین و دستور ہی مذہبی اصول پر مرتب ہوگا، خود اس بات کو تسلیم

کرلیا کہ وہ انسانیت کو صرف مذہب کے معیار سے جانچے گی اور اس طرح گویا اس نے ہندوستان کو بھی سوچنے کا موقع دیا کہ دنیا کے معاملات میں اگر اسلام اتنی بڑی قیمت رکھتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ "کفر و نامسلمانی" کو بالکل "جنس کاسد" قرار دیا جائے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اس وقت مذہب کے نام سے کوئی حکومت ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتی اور حکومتوں کی برادری میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔ اسلئے اگر پاکستان نے آج اپنی اس غلطی پر اصرار کیا تو کل لازماً اسے اپنی اس غلطی کا اعتراف کرنا پڑے گا اور ہوسکتا ہے کہ یہ کل وہ ہو جس کے بعد کوئی دوسرا کل آنے والا نہیں۔

الغرض پاکستان میں اسکے زمانۂ قیام سے لیکر اس وقت تک یہی مذہبی فضا پیدا کی گئی۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے بات بات میں "کتاب و سنت" کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ وہ کوئی بڑے شب زندہ دار مسلمان تھے، بلکہ محض اس لئے کہ اس طرح وہ پاکستانی عوام کے جذبات کے ساتھ اچھی طرح کھیل سکتے تھے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب کا دور آیا، سو کچھ تو واقعتاً یہ نوابزادہ سے زیادہ مسلمان تھے بھی اور کچھ اس لئے کہ سوال اپنی قدح کی خیر منانے کا بھی تھا۔ بہر حال انھوں نے بھی مذہبیت ہی کا سہارا ڈھونڈھا، یہاں تک کہ چند دن میں جدھر دیکھئے پاکستان کے اندر مولوی ہی مولوی پھنکار مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ لیکن وہ تو کہئے کہ قدرت کو جلد از جلد کوئی وعید نازل کرکے پاکستان کو چونکانا منظور تھا کہ پہلے تو "قادیان دشمنی" تحریک کے ذریعہ سے خواجہ ناظم الدین ہی کے ہاتھ سے مولویوں کا سر کچلوایا جنھوں نے ان کو سر چڑھایا تھا اور پھر خود خواجہ صاحب کو بھی منصب حکومت سے معزول کرا دیا۔ سچ ہے۔

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

پھر اب کہ محمد علی کا دور ہے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دور "دورِ شجاع" ہے کہ حافظ کی طرح "مے دلیرانہ بنوش" کی دعوتِ عام دی جائے تاہم "دعوتِ برگ و نوا" ضرور ہے اور یہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ غالباً اب "پیرِ کنعاں اور اس کی پیراہن پرستی" کا زمانہ واپس نہ آئے گا اور پاکستان کی جدید وزارت کا "Slogan" "کتاب و سنت" نہیں بلکہ

بیفشاں دامن و آزردہ برخیز ——— ہوگا

اس وقت تک پاکستان سے جتنی خبریں ہم تک پہونچی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی فضا ابھی تک صاف نہیں ہے اور خواجہ صاحب پر

غمِ بے مہری ایں داستاں سوخت

کا سوگ ہنوز طاری ہے، لیکن یہ زیادہ فکر کی بات نہیں۔

ہے کیا جو کس کے باندھئے، میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

تاہم یہ تو یقینی ہے کہ مسٹر محمد علی کو بادِ مخالف کے سمت جانے والی کشتی کا رخ بادِ موافق کی طرف پھیرنا ہے اور اگر یہ زیادہ دشوار نہیں تو ایسا آسان بھی نہیں! میں سمجھتا ہوں کہ یہ انقلاب وزارت پاکستان میں ایک نئے دور کا طلوع ہے اور اس وقت تک مسٹر محمد علی اور بعض ان کے رفقاء (مثلاً مسٹر شعیب قریشی) نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان سے معاملہ فہمی، بالغ نظری اور وقت شناسی کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بارہا ظاہر کر چکے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں کا مفاد اسی میں ہے کہ ان کے تعلقات نہ صرف خوشگوار بلکہ دوستانہ رہیں اور تقسیم ہند کے بعد جو زخم دونوں کے دلوں میں پیدا ہوگئے ہیں انھیں کھجا کھجا کر ہرا نہ کریں بلکہ اگر کسی فریق کی طرف سے اشتعال انگیز باتیں ظاہر ہوں تو بھی ان کے جواب میں انتقامی جذبہ سے کام نہ لیں۔

ہندوستان و پاکستان کی جغرافی پوزیشن بلکہ گوشت و ناخن کی سی حیثیت رکھتی ہے اور ان دونوں کو جدا کرنے کی کوشش

تباہی کو دعوت دینا ہے خواہ اس کا باعث ہندوستان ہو یا پاکستان۔

پاکستان اب ایک مستقل حکومت ہے، جداگانہ سیاسی سالمیت ہے، اس کو اپنے ماضی سے ہٹ کر بالکل ایک نیا مستقبل بنانا ہے اور اس کے لئے گرم خون نہیں بلکہ ٹھنڈے خون کی ضرورت ہے، خود اعتمادی کی ضرورت ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر مشتعل ہوجانے کے بجائے ہنستے ہوئے گزر جانے کی ضرورت ہے اور ہندوستان کے ساتھ ایک مضبوط فضائے اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ۲۸ اپریل کے اخبار میں مسٹر محمد علی کا وہ بیان نظر سے گزرا جس میں انھوں نے ہندوستان کے ساتھ رابطۂ خلوص واتحاد قایم کرنے کا ذکر کیا ہے اور ایسے الفاظ میں جو اس سے قبل نہ کبھی نوابزادہ مرحوم کے منھ سے نکلے تھے اور نہ خواجہ صاحب کی زبان فیض ترجمان سے۔

ہم اسے پاکستان اور ہندوستان دونوں کے لئے ایک نئی صبح امید کا طلوع سمجھتے ہیں اور یقین ہے کہ نہرو اور محمد علی کا باہمی تبادلۂ خیال دونوں ملکوں کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا — خلوص و محبت کا دور — ترقی و خوشحالی کا دور — رواداری وانسانیت کا دور!

مسٹر محمد علی نے جس جوش وولولہ سے نہرو کے ساتھ تبادلۂ خیال کی خواہش ظاہر کی ہے، اس کا اقتضاء یہ تھا کہ جلد از جلد اس پر عمل بھی کیا جاتا، لیکن ایسا غالباً ممکن نہ ہوگا، کیونکہ اول تو مسٹر محمد علی کو خود بھی اپنی پوزیشن پاکستان میں مضبوط و استوار کرنا ہے اور دوسرے یہ کہ ملکۂ انگلستان کی تقریب تاجپوشی کے سلسلہ میں دولت مشترکہ کے وزراء کی کانفرنس جون میں ہونے والی ہے اور یقیناً یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ نہرو اور محمد علی پہلے اس کانفرنس میں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ ان دونوں کی آیندہ ملاقات میں کشمیر کے مسئلہ پر بھی گفتگو ہوگی اور اگر اس طرح واقعی کوئی صورت مصالحت کی پیدا ہوگئی تو ہم اسے نہرو اور محمد علی دونوں کا معجزہ سمجھیں گے۔

اس وقت تک مسٹر محمد علی کے رجحانات کے بابت جو کچھ اخبارات سے معلوم ہوا ہے، اس میں ایک بات زیادہ کھٹکنے والی ہے اور وہ "دفاع مشرق وسطی" میں شرکت کا مسئلہ ہے۔ گو اس وقت تک پاکستان نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے کہ اسے بھی شرکت کی دعوت دی گئی ہے لیکن مسٹر محمد علی کے اندازِ بیان سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ اگر پاکستان کو ایسی دعوت دی گئی تو وہ اسے قبول کرلے گا اگر واقعی یہ شرکت اسکے لئے مفید ہوئی — لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شرکت قطعاً اس کے لئے مفید نہ ہوگی اور اسے بھی جلد یا بدیر محسوس کرنا پڑے گا کہ اس کا یہ — "اگر" کس قدر غلط تھا — علاوہ اس کے یوں بھی اگر مسٹر محمد علی ہندوستان و پاکستان کی مشترکہ دفاعی تنظیم کو ضروری سمجھتے ہیں، جیسا کہ انھوں نے ظاہر کیا ہے، تو انھیں دفاع "مشرق وسطی" میں شرکت کا خیال ترک کرنا پڑے گا، کیونکہ ہندوستان کبھی اس کو پسند نہیں کرسکتا کہ پاکستان کسی دوسری سلطنت سے کوئی ایسا معاہدہ کر بیٹھے جو آتشِ جنگ کو کسی وقت بھی ہندوستان سے قریب تر لاسکتا ہے۔ بہرحال اس وقت جو حالات سامنے ہیں انکو دیکھتے ہوئے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ پاکستان وہندوستان دونوں رواداری سے کام لیکر آپس میں مل بیٹھنے کی کوئی صورت نکال لیں گے۔

و ہذا ما کنا نبغی!

آیندہ سالنامہ ۵۴ء

سالنامہ نکالنے کے بعد مجھے یک گونہ اطمینان تو ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ خلش بھی شروع ہو جاتی ہے کہ آیندہ سالنامہ کے لئے کس موضوع کا انتخاب کیا جائے۔ موضوع کی جستجو میں کئی باتیں میرے سامنے ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ دلچسپ بھی ہو اور مفید بھی، دوسرے یہ کہ اس پر اچھا لکھنے والے آسانی سے مل سکیں، تیسرے یہ کہ اگر ایسے حضرات نہ مل سکیں تو میں خود تنہا اس خدمت کو انجام دے سکوں۔ چنانچہ اس وقت تک نگار کے کئی سالنامے ایسے نکل چکے ہیں جن کے لئے صرف مجھی کو شروع سے اخیر تک لکھنا پڑا ہے۔

امسال داغ نمبر نکالنے کے بعد، یہ فیصلہ تو خیر میں کرچکا تھا کہ آیندہ سالنامہ شعروشاعری یا ادب وانشاء سے متعلق ہوگا لیکن پھر وہ کیا ہوگا، اس کا فیصلہ مشکل تھا۔ میں نے بعض احباب سے مشورہ کیا تو انھوں نے گھوم پھر کر وہی "شعروادب" کا

ذکر چھیڑ دیا - اور آخرکار کامل تین ماہ کے غور و فکر کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ آیندہ سالنامہ اسلامی تاریخ سے متعلق ہونا چاہئے اور اس سلسلہ میں کوئی ایسی چیز پیش کرنا چاہئے جس میں جدت ہو، دلچسپی ہو اور افادیت بھی اور اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے طے کیا کہ آیندہ سالنامہ

"فرمانروایانِ اسلام"

کے لئے وقف ہونا چاہئے - یہ بات تو شاید سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں حکومت کی بنیاد عہدِ بنی امیہ سے پڑی، لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ آگاہ ہوں گے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ دنیا میں ان کی کتنی سلطنتیں کہاں کہاں قایم ہوئیں اور وہ کس طرح ختم ہوئیں -

چند حکومتوں کا علم تو خیر سب کو ہے، کیونکہ وہ بہت مشہور ہیں، لیکن باقی کا علم عوام کیا خواص کو بھی نہیں ہے اور انکی تعداد اتنی ہے کہ اگر میں ان کا نام گنوانے بیٹھوں تو صفحے کے صفحے صرف اسم نویسی ہی میں سیاہ ہو جائیں -

یقیناً ان تمام مسلم حکمراں خاندانوں کا استقصاء آسان بات نہیں اور یہ کام اتنا ہی دشوار ہے جیسے آپ کسی گلاس کو فرش پر پٹک دیں اور پھر اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو یکجا کرنا چاہیں، لیکن بہرحال یہ ایک کام ہے اگر ہو جائے — انگریزی میں اس قسم کی ایک مشہور کتاب "Mohamedan Dynasties" لین پول کی لکھی ہوئی موجود ہے، اور گو اس میں بھی تمام مسلم حکومتوں کا استقصاء نہیں کیا گیا ہے، لیکن اردو میں تو کوئی ایسی کتاب بھی موجود نہیں ہے — اور اگر آج آپ کو یہ معلوم کرنا ہو کہ دنیا میں مسلمانوں کے قدم کہاں کہاں پہونچے، انھوں نے کہاں کہاں کس کس زمانہ میں کس کس نام سے اپنی حکومتیں قایم کیں، ان کے سوک مراء کے کیا نام تھے، کس سلسلہ سے کن کن سنین میں وہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور پھر یہ کہ یہ حکومتیں کب اور کیوں ختم ہوئیں، تو آپ کے پاس اس علم کا کوئی ذریعہ اس کے سوا نہیں کہ آپ سیکڑوں تاریخی کتابوں کی ورق گردانی کریں، عمر کا کافی حصہ ان کتابوں کے مطالعہ میں صرف کر دیں اور پھر بھی شاید آپ کو پورا علم حاصل نہ ہو

اسی خیال کے پیشِ نظر عرصہ سے خیال تھا کہ ایک ایسا سلسلۂ تحقیق شروع کیا جائے جس کے ذریعہ سے سلسلہ وار

فرمانروایانِ اسلام - مفکرینِ اسلام - علمائے اسلام - وقایع اسلام اور اماکنِ اسلام

کی تاریخ کو دائرۃ المعارف (انسائکلوپیڈیا) کی صورت سے پیش کیا جا سکے، لیکن عملی حیثیت سے قدم اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی

اب جو سالنامہ ۶۴ء کا مسئلہ سامنے آیا تو میں نے سوچا کیوں نہ اس سلسلہ کو شروع کر دیا جائے اور اس خیال نے ایسی مستحکم صورت اختیار کر لی کہ آخرکار "فرمانروایانِ اسلام" کے نام سے اس سلسلہ کی پہلی قسط آیندہ سالنامہ کی صورت میں پیش کرنا طے کر لیا یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کام تنہا مجھ کو کرنا ہے، اس لئے نہیں کہ ملک میں ایسا کام کرنے والے نہیں ہیں، ہیں اور یقیناً مجھ سے زیادہ اہل ہیں، لیکن افسوس ہے کہ میں ان کی خدمات حاصل کرنے سے معذور ہوں - چنانچہ میں نے ۱۵ اپریل سے یہ کام شروع کر دیا ہے اور امید ہے کہ آیندہ ۶ ماہ کے اندر میں اسے پورا کر سکوں گا -

ہو سکتا ہے کہ آپ کے لئے یہ چیز زیادہ دلچسپی کا باعث نہ ہو لیکن اس کے مفید ہونے سے بہرحال آپ کو بھی انکار نہ ہوگا اور اس بناء پر اگر میں آپ سے یہ توقع رکھوں کہ اس کام میں آپ میری مدد فرمائیں گے تو غالباً یہ توقع بے محل نہ ہوگی -

اس سلسلہ میں آپ سے میں کوئی عطیہ نہیں چاہتا بلکہ صرف اتنی مدد چاہتا ہوں کہ آپ "نگار" کی توسیع اشاعت میں حصہ لیں اپنے احباب میں، طلبہ و اساتذہ کے حلقہ میں اور لائبریریوں میں اس سالنامہ کو مقبول بنانے کی پوری کوشش فرمائیں، اور اگر یہ ممکن نہیں تو اپنے سلسلۂ خریداری کو تو کم از کم قایم ہی رہنے دیں -

اسلامی تہذیب و ثقافت

عہدِ نبوی سے عہدِ بنی امیہ تک

عہدِ رسالت و خلفاءِ راشدہ

رسول اللہ کی ذات زہد و انکسار کا مجسم پیکر تھی۔ اگر آپ چاہتے تو جناب خدیجہؓ سے شادی کے بعد ہی ان کے مال سے تجارت کرکے اپنے لئے ہر قسم کا آرام اور آسایش مہیا کرسکتے تھے لیکن دنیاوی آرام و آسایش کا تصور بھی آپ کے ذہن میں نہیں آیا اور ہمیشہ نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ آپ کے بعد خلفاء راشدین بھی اپنی فتوحات کی وجہ سے ہر قسم کا دنیاوی جاہ و جلال حاصل کرسکتے تھے لیکن ان کو ذات نبوی سے ایسی والہانہ شیفتگی تھی کہ انھوں نے اتباعِ سنت کے علاوہ اور کوئی طریقۂ زندگی اختیار نہیں کیا۔ فرشِ خاک کو مسندِ شاہی سمجھ کر اخوت و مساوات اور عدل و انصاف کے ساتھ مسلمانوں اور دوسری قوموں پر حکمرانی کی۔

خلفاء راشدین کی حکومت خالص دینی حکومت تھی جس کو نمود و نمایش سے کوئی تعلق نہ تھا، وہ بازاروں میں پیوند لگے کپڑے اور پھٹے جوتے پہن کر عام لوگوں کی طرح چکر لگاتے تھے تاکہ ہر شخص ہر وقت ہر جگہ بغیر کسی روک ٹوک کے ان سے مل سکے۔ وہ غریبوں اور بیوہ عورتوں کی خدمت کے لئے ہر وقت طیار رہتے تھے، یہاں تک کہ اپنے کندھے پر مشک رکھ کر کسی بیوہ کے گھر پانی پہونچا دینے میں ان کو مطلق عار نہ ہوتا تھا۔ خلفاء میں بعض صاحبِ جائداد اور ذی ثروت بھی تھے لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنی دولت صرف نیک کاموں میں صرف کی اور اپنی ذات پر بہت کم خرچ کیا۔ کھانے میں بھی وہ بڑے محتاط تھے اور صرف اس قدر کھاتے تھے جو ان کی صحت کو قایم رکھ سکے چنانچہ مشہور حدیث ہے:۔ "نحن قوم لا ناکل حتی نجیع و اذا اکلنا لا نشبع" (ہم وہ قوم ہیں کہ جب تک بھوک نہیں لگتی کھانا نہیں کھاتے اور جب کھاتے ہیں تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتے) رسول مقبول صلعم کا ایک اور قول ہے "ما ملاء ابن آدم وعاءً شراً من بطنہ حسب ابن آدم لقیمات یقمن صلبہ" (ابن آدم نے ایسا کوئی برتن نہیں بھرا جو اس کے پیٹ سے زیادہ بدتر ہو ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھ سکیں)۔

حضرت عائشہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی۔ رسول اکرم نے مسلسل تین دن تک پیٹ بھر کے روٹی نہیں کھائی الغرض رسول اکرم اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی تھی۔

عہدِ بنی امیہ

جب زمامِ خلافت خاندان بنی امیہ کے ہاتھوں میں آئی تو رسول اکرم کی پیشین گوئی کے مطابق خلافت سلطنت میں تبدیل ہوگئی اور بہت سی اجنبی عادتیں انھوں نے اختیار کرلیں نتیجہ یہ ہوا کہ دینی حکومت کے بجائے بنو امیہ کی حکومت دنیاوی سلطنت ہوگئی اور شاہانہ جاہ و جلال میں مفتوحہ اقوام کی تقلید ہونے لگی۔ امیر معاویہ پہلے شخص تھے جنھوں نے انتخابی خلافت کو میراثی خلافت میں بدل دیا۔ امیر معاویہ ہی نے حاجب و دربان مقرر کئے اور شاہی شان و شوکت کے لوازم اختیار کئے۔ جامع مسجد میں اپنے لئے ایک علٰحدہ مقصورہ طیار کیا جہاں وہ نماز پڑھتے تھے اور جس وقت وہ سجدہ کرتے تھے تو ایک محافظ ننگی تلوار لئے ہوئے خلیفہ کے پاس کھڑا رہتا تھا یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طریقہ سے خلیفہ کی شان و شوکت کا اظہار مقصود تھا یا دشمن کے ناگہانی حملے سے بچنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ کیونکہ حضرت علیؓ

کی شہادت بھی ناگہانی حملے سے ہوئی تھی اور خود امیر معاویہ بھی ایک بار اتفاقاً اس طرح کے حملے سے بچ گئے تھے۔

خلیفہ کے فرائض میں امامت بھی ایک مقدس فرض تھا جسے خلفائے راشدین خود انجام دیتے تھے۔ بنوامیہ کے دور میں بھی امیر معاویہ، عبدالملک بن مروان اور عمر بن عبدالعزیز نے اس فرض کو خود انجام دیا لیکن اس خاندان کے دیگر خلفا نے اس اہم فرض کی ادائی رئیس الحرس اور صاحب شرطہ کے سپرد کردی۔ خلفاء بنوامیہ سفید چادر اور سفید مرصع عمامہ پہن کر مسجد میں آتے تھے اور جمعہ کے دن جب خطبہ دینے کھڑے ہوتے تھے تو ان کی انگلی میں انگوٹھی اور ہاتھ میں عصا ہوتا تھا جو جہانداری کا نشان خیال کیا جاتا تھا۔

امیر معاویہ کے دربار کی شان و شوکت اور وہاں کا طریقۂ باریابی بھی ملوک عجم کا سا تھا، انھوں نے ایک بڑا شاندار قصر تعمیر کرایا اور اس میں تخت خلافت نصب کیا۔ جب وہ اس تخت پر بیٹھتے تھے تو داہنے جانب خاندان خلافت کے امراء اور بائیں جانب دوسرے بڑے امراء کھڑے ہوتے تھے اور جو شخص خلیفہ کے حضوری کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا وہ سامنے کھڑا ہوتا تھا۔

خاندان بنی امیہ کے بعض افراد نے تعیش کے بہت سے طریقے رومی اور دوسری قوموں سے اخذ کئے اور اس میں ایسے منہمک ہوئے کہ امور سلطنت سے بے توجہ ہوگئے۔ ایسے خلفاء میں بدترین یزید بن عبدالملک خیال کیا جاتا ہے جو اپنی کنیزوں (حبابہ اور سلامہ) کے ساتھ ہر وقت لہو و لعب میں مصروف رہتا تھا۔ لیکن اس خاندان میں ایسے ایسے خلیفہ بھی ہوئے ہیں جو عقل و دانش، سیاست، شجاعت، علم و فضل سے بھی متصف تھے اور ان میں عبدالملک بن مروان نہایت مدبر حکمراں اور بڑا زبردست عالم تھا۔ مورخین کا اس کے متعلق خیال ہے کہ اس کو اگر تخت خلافت نہ ملتا تو یہ کسی مسند علم کی زینت ہوتا۔ اس کا جانشین ولید بن عبدالملک گو باپ کی طرح ذی علم نہ تھا لیکن تدبیر جہاں بانی اور توسیع فتوحات کے لئے مشہور ہے۔ اس کے زمانے میں ہند، اسپین اور شمالی افریقہ کے مختلف حصوں کی فتوحات ہوئیں جس کی بنا پر اسے خاندان بنی امیہ کے مشہور خلفا میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی خاندان کے مشہور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز تھے جو سادگی زہد اور انصاف میں بہت ممتاز تھے۔ اکابر علماء ان کی علمی فضیلت کے قائل تھے۔

گھوڑوں کا شوق عرب گھوڑوں کے بہت شایق تھے۔ ظہور اسلام کے بعد رسول نے سواری سیکھنے کی ہدایت فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔ "ارکبوا وارموا ان ترموا احب الیّ من ان ترکبوا" (سوار ہو اور تیر چلاؤ تیر چلانا سواری سے زیادہ مجھ کو پسند ہے)۔ بنی امیہ کے زمانہ میں اہم ترین دلچسپی کا شغل گھوڑ دوڑ تھا۔ ہشام بن عبدالملک پہلا شخص تھا جس نے گھوڑ دوڑ کے لئے باقاعدہ گھوڑے جمع کئے اور گھوڑوں کی نسل کی بہتری کا پورا انتظام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانہ میں گھوڑوں کی تعداد ہزار تک پہونچ گئی تھی۔ مسعودی کے بیان کے مطابق عورتیں بھی سواری سیکھتی تھیں اور گھوڑ دوڑ میں شریک ہوتی تھیں۔ ولید ثانی بھی گھوڑ دوڑ کا بہت شایق تھا۔ اس نے گھوڑ دوڑ کے متعدد میدان بنوائے۔ ولید کے پاس ایک مشہور گھوڑا سندی نامی تھا جو ہشام کے مشہور گھوڑے زائدہ سے کبھی کبھی بازی لے جاتا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں گھوڑے عموماً اول و دوئم آنے میں بہت مشہور تھے۔ ولید نے رصافہ میں ایک گھوڑ دوڑ کرائی اور خود وہیں قیام کرکے اس کا انتظام کیا۔ اس گھوڑ دوڑ میں بھی ہزار گھوڑے شریک تھے گھوڑ دوڑ کے متعلق ولید کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ اس زمانہ کے مشہور گھوڑے زائدہ، سندی اور وضاع تھے۔

بازی جیتنے والے گھوڑوں کے حسب ذیل اصطلاحی نام تھے:۔

۱۔ اول نمبر پر آنے والا گھوڑا سابق کہلاتا تھا۔

دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو مصلیٰ کہتے تھے کیونکہ اس کا سر اول آنے والے گھوڑے کی وسط پشت یعنی صلا کے پاس ہوتا تھا۔

سوئم و چہارم نمبر پر آنے والے گھوڑوں کو ثالث و رابع کہتے تھے۔ چنانچہ اس طریقہ سے دسویں نمبر پر آنے والے گھوڑے کو عاشر کہتے تھے۔ گھوڑ دوڑ میں دس نمبر تک گھوڑوں کا شمار ہوتا تھا۔

چوگان۔ شکار۔ شطرنج۔ تاش آخر عہد بنی امیہ میں پولو یعنی چوگان کا کھیل بھی بہت مقبول ہوا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کھیل عربوں نے ایرانیوں سے سیکھا۔ شکار کا شوق عربوں میں ہمیشہ سے موجود تھا۔ یمنی کتوں کو شکار کے لئے طیار کرنا بہت عام بات تھی ——————— چیتے کو بھی شکار کرنا سکھاتے تھے خلفاء بنی امیہ میں یزید بن معاویہ شکار کا بہت شایق تھا۔ یہ چیتے سے بھی شکار کھیلتا تھا۔ یہ شکاری کتوں کو نہایت اہتمام کے ساتھ رکھتا تھا۔ ان کے گلے میں سونے کا پٹہ ہوتا تھا اور ہر کتے کی دیکھ بھال کے لئے علٰحدہ ملازم مقرر تھا۔

خلفائے بنی امیہ کے زمانہ میں مرغ لڑانے کا بھی لوگوں کو شوق تھا اور نرد و شطرنج سے لوگوں کی دلچسپی تھی۔

موسیقی خلفائے بنی امیہ کے زمانہ میں غنا و موسیقی کی طرف بھی کافی توجہ کی گئی۔ اس ذوق کے خلفا میں یزید بن عبدالملک کو خاص شہرت حاصل تھی۔

ایک دن اس کے بھائی مسلمہ بن عبدالملک نے ملامت کی کہ آپ عمر بن عبدالعزیز ایسے خلیفہ کے جانشین ہیں اور آپ کا یہ حال ہے کہ دو لونڈیوں کی وجہ سے خلافت کے کاروبار اور فریادیوں سے بالکل غافل ہیں۔ اس ملامت کا یزید پر بڑا اثر ہوا اور عیش و عشرت کو ترک کر کے ان لونڈیوں سے دور رہنے لگا۔ جب حبابہ کی آتش شوق بھڑکی تو اسنے خلیفہ سے ملنے کی کوشش کی۔ حبابہ نے اپنی ملازمہ سے کہا کہ جب خلیفہ جمعہ کے دن ایوان سے نماز کے لئے نکلیں تو مجھ کو مطلع کرنا۔ چنانچہ خلیفہ جب جمعہ کے دن نماز کے لئے ایوان سے نکلے تو ملازمہ نے مالکہ کے حکم کی تعمیل کی۔ حبابہ ہاتھ میں عود لیکر خلیفہ کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور نہایت دلکش آواز میں گانا شروع کیا۔

ألا لا تلمه اليوم ان يتبلد　　فقد غلب المحزون ان يتجلد

اس جہالت پر اس کو ملامت نہ کر کیونکہ غمگین پر بہ تکلف صبر کرنا غالب آرہا ہے۔ جب اس شعر پر پہونچی

فما العيش الا ما تلذ و تشتهي　　ان لام فيه ذو شنان و فندا

(عیش تو وہی ہے جو تجھکو اچھا معلوم ہو اور جس کی تو خواہش کرے اگرچہ کینہ ور اس کے بارے میں ملامت کرے اور بیوقوف بنائے)۔ یزید بے خود ہو کر لپٹ گیا اور کہنے لگا جو مجھ کو تجھ سے دور رہنے کی نصیحت کرے خدا اس کا بُرا کرے" چنانچہ یزید پھر انھیں لذائذ میں مصروف ہو گیا۔ یزید کو حبابہ سے اس قدر محبت تھی کہ اس کے مرنے کے بعد خود بھی اس کی محبت میں گھل گھل کر مرگیا۔ یہ واقعہ تو بنی امیہ کی خلافت کے انحطاط کا ہے لیکن عروج کے زمانہ کے متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں کہ بیدار مغز خلفاء سلطنت کے کاروبار میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یزید ہی کے باپ مشہور خلیفہ عبدالملک بن مروان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ مصعب بن زبیر کے مقابلہ میں لڑنے کے لئے نکلا تو اس کی بیوی عاتکہ نے جو اس کو بہت محبوب تھی روکنا چاہا، لیکن اس نے مطلق پروانہ کی۔

کتاب الاغانی میں بہت سے قصے پائے جاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ بنی امیہ کے زمانہ میں حجاز فنون لطیفہ یعنی غنا، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں شام و عراق سے سبقت لے گیا تھا۔ حالانکہ بادی النظر میں یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے

کہ حجاز نے باوجود ویران و غیر آباد ہونے کے شام و عراق سے جن میں مختلف تہذیبوں کا اثر رہا کیسے تفوق حاصل کیا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ حجاز کا ذوق و شعور زیادہ ترقی یافتہ تھا اس کے علاوہ یہ کہ اہل حجاز میں مذہبی تحمل اور رواداری زیادہ تھی۔ کتاب الاغانی میں اس بیان کی تائید میں بہت قصے ملتے ہیں۔ مثلاً ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

داؤد ثقفی نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ابن جریج کے حلقے میں بیٹھے تھے وہ حدیث بیان کر رہے تھے۔ عبد اللہ بن مبارک اور عراق کے دوسرے لوگ بھی اس حلقے میں شریک تھے۔ اسی اثناء میں مشہور مغنی ابن میزن اس طرف آنکلا۔ ابن جریج نے اس کو بلاکر کچھ سنانے کو کہا ——— اس نے جواب دیا کہ میں اس وقت جلدی میں ہوں جب ابن جریج نے اصرار کیا تو اس نے کچھ سنایا اور چلتے وقت کہنے لگا کہ اگر آپ کے پاس عراق کے بد ذوق لوگ نہ ہوتے تو میں آپ کو اور کچھ سناتا اور آپ کی طبیعت خوش کرتا۔ ابن جریج نے عراق کے لوگوں سے مخاطب ہوکر پوچھا کہ کیا آپ لوگوں کو میری یہ بات بری معلوم ہوئی انھوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ غنا کو مکروہ ضرور خیال کرتے ہیں۔ ابن جریج نے ان سے دوبارہ سوال کیا کہ رجز خوانی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اس کو مکروہ خیال نہیں کرتے۔ اس پر ابن جریج نے کہا کہ غنا اور رجز میں کیا فرق ہے۔

حجاز میں فنون لطیفہ کی ترقی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ حجاز اور مکہ و مدینہ کے جوار میں اس وقت بہت سے مشہور مغنی موجود تھے یہ حج کے زمانہ میں علحدہ قافلے کی صورت سے حج کرنے آتے اور لوگ ان کی ہمت افزائی کرتے اس زمانہ میں حجاز کے ارباب غنا کی فہرست بہت طویل ہے۔ بعض مشاہیر کے نام یہ ہیں:-

جمیلہ۔ طویس۔ نومۃ الضحیٰ۔ رحمۃ۔ ہبۃ اللہ۔ مالک۔ ابن عائشہ۔ نافع بن طنبورہ۔ حبابہ۔ سلامہ۔ سعیدہ۔ الزرقاء

بنی امیہ کے زمانہ میں موسیقی کی طرف لوگ بہت مائل تھے۔ چنانچہ امام مالک بھی شروع میں مغنیوں کے ساتھ رہتے تھے اور ان سے گانا سیکھتے تھے۔ ایک دن ان کی والدہ نے کہا کہ اے بیٹے بدصورت مغنی کی طرف کوئی التفات نہیں کرتا۔ بہتر ہے کہ تم غنا کو چھوڑ کر فقہ پڑھو۔ فقہ میں بدصورت بھی نقصان میں نہیں رہتا۔ چنانچہ انھوں نے غنا چھوڑ کر فقہ پڑھنا شروع کی۔ غنا کے ساتھ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں بھی حجاز نے بڑی ترقی کی۔ ناضری اہل مدینہ کا مشہور لطیفہ گو خیال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اشعب مشہور ہوا جس کے لطائف بہت مشہور ہوئے۔

خاندانی نظام زمانۂ جاہلیت میں بھی عرب ایک سے زیادہ شادیاں کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ قبایل میں باہمی جنگ کی وجہ سے مردوں کی تعداد کم ہوگئی تھی۔ اسلام نے اس رواج کو محدود کر دیا اور بیک وقت صرف چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی، اس وقت بھی مردوں کی تعداد غزوات میں شرکت کی وجہ سے کم ہوگئی تھی۔ علاوہ اس کے ایک سے زیادہ شادی جایز رکھنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ بیوہ عورتیں اور ایسی غریب لڑکیاں جن کی شادی نہ ہوتی تھی بے بیاہی نہ رہ جائیں، لیکن اس کے باوجود ایک سے زیادہ شادی کرنے کی حالت میں ہر عورت کے ساتھ مساوات کی سخت شرط عاید کی گئی ہے۔ اسلام میں طلاق دینے کا اختیار ہے لیکن طلاق "ابغض المباحات" (جایز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ) خیال کی گئی ہے۔ یعنی اس اجازت سے فایدہ اٹھانا اچھا نہیں ہے۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے باہمی مصالحت کے لئے مشورہ دیا گیا ہے اور اگر بدرجۂ مجبوری طلاق دینی پڑی تو اس کے ساتھ حسن سلوک کی بھی بجد تاکید ہے۔

عورتیں عرب عورتیں ہمیشہ آزادی سے فایدہ اٹھاتی تھیں۔ آغاز اسلام میں عورتیں لڑائیوں میں مرہم پٹی اور مردوں کے جذبات شجاعت برانگیختہ کرنے کے لئے شریک ہوتی تھیں۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں ذی علم، فصیح اور بہادر عورتوں کے متعدد تذکرے پائے جاتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ نے جو حدیث فقہ اور نسب وغیرہ کی مشہور عالمہ تھیں

جنگ جمل میں فوجوں کی قیادت کی۔ اسی طرح اسماء بنت ابوبکر جو عبداللہ بن زبیر کی والدہ تھیں۔ روایت حدیث اور شجاعت میں مشہور تھیں۔ ان کی وہ نصیحت جو انھوں نے حجاج کے محاصرۂ مکہ کے وقت اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر کو دی تھی صبر و استقلال کی بہترین دعوت تھی۔ اس زمانہ کی عورتوں میں عکرمہ بنت الحرش تھیں جنھوں نے عراقی فوج کے جنگی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے جنگ صفین کے موقع پر امیر معاویہ کے خلاف اور حضرت علی کی موافقت میں نہایت فصیح پر جوش تقریر کی تھی۔

خلفاء بنی امیہ کے زمانہ میں بعض عورتیں اپنی قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے خلفاء بنی امیہ پر کافی اثر رکھتی تھیں خلیفہ عبدالملک جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نازک اوقات میں پریشان نہ ہوتا تھا اور مشکلات اور مصائب کے ہجوم میں اس کی ہمت اور زیادہ ہو جاتی تھی۔ اپنی بیوی عاتکہ سے بہت مرعوب رہتا تھا۔ چنانچہ عاتکہ نے ایک مرتبہ عبدالملک سے ناراض ہوکر دروازہ بند کرلیا اور عبدالملک کو اپنے پاس آنے سے منع کر دیا۔ عبدالملک صلح کی کوشش میں ناکامیاب ہونے کی وجہ سے غمگین رہنے لگا۔ عبدالملک کے ایک مصاحب نے صلح کرانے کا وعدہ کیا۔ - - - - - - - - - - -

- - - - یہ مصاحب عاتکہ کے پاس گریہ وزاری کرتا ہوا گیا اور اس سے کہا کہ میرے صرف دو بیٹے تھے۔ ایک بیٹے نے اپنے بھائی کو مار ڈالا جس کی وجہ سے خلیفہ نے دوسرے کو جو بچ گیا تھا بھائی کے مار ڈالنے کی پاداش میں قتل کا حکم دیا ہے۔ یہ فیصلہ صرف آپ ہی کی سفارش سے منسوخ ہو سکتا ہے، مصاحب نے اس قصہ کو عاتکہ کے سامنے اس طرح سے پیش کیا کہ عاتکہ کو رحم آگیا اور وہ فوراً خلیفہ کے پاس سفارش کو چلی گئی۔ خلیفہ نے پہلے عذر و معذرت کی لیکن بعد میں صرف عاتکہ کی سفارش کی وجہ سے معاف کرنے کا وعدہ کیا۔ عبدالملک نے اس مصاحب کو بہت کچھ انعام و اکرام دیا۔

مسعودی نے ولید بن عبدالملک کی بیوی ام البنین کا ایک قصہ بیان کیا ہے جس سے اس زمانہ کی عورتوں کی بلاغت اور قوت استدلال کا پتہ چلتا ہے۔ ایک دن حجاج بن یوسف مسلح ولید بن عبدالملک کے پاس بیٹھا تھا اور ولید معمولی کپڑے پہنے بیٹھا ہوا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ حجاج نے ولید سے کہا کہ ابن اشعث اور عبداللہ بن زبیر کی بغاوت نے مجھ کو اس قدر مشغول رکھا کہ میں آپ سے دور رہا۔ اسی اثنا میں ایک لونڈی آئی اور چپکے سے کان میں کچھ کہہ کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہی لونڈی پھر آئی اور چپکے سے پھر کچھ کان میں کہہ کر چلی گئی۔ ولید نے حجاج سے پوچھا کہ تم سمجھے اس لونڈی نے کیا بات کی حجاج نے جواب دیا کہ میں کچھ نہیں سمجھا۔ ولید نے بتایا کہ اس لونڈی سے ام البنین نے کہلا بھیجا تھا کہ آپ کی نشست اس مسلح عرب کے ساتھ اس طرح مناسب نہیں مینے کہلا بھیجا کہ یہ حجاج ہے اس پر ام البنین اور خائف ہوئیں اور دوبارہ کہلا بھیجا کہ خدا کی قسم میں نہیں پسند کرتی کہ یہ آدمی جس نے اتنی زیادہ خلق کو قتل کیا ہو آپ کے پاس مسلح بیٹھے اور آپ غیر مسلح ہوں۔ حجاج نے کہا کہ اے امیر المومنین عورتوں کے ساتھ تفریح کی باتیں زیادہ نہ کیا کیجئے اور نہ اپنے راز سے ان کو آگاہ، کسی اہم کام میں ان سے مشورہ بھی نہ کیجئے کیونکہ عورت کی رائے ضعیف ہوتی ہے۔

جب حجاج چلا گیا تو ولید، ام البنین کے پاس گیا اور ان باتوں کا ذکر کیا۔ ام البنین نے ولید سے درخواست کی کہ حجاج کو ام البنین کے پاس بھیجدے۔ دوسرے دن جب حجاج، ولید کے پاس آیا تو ولید نے حجاج کو ام البنین کے پاس جانے کا حکم دیا پہلے تو حجاج نے معافی چاہی لیکن جب ولید نے اصرار کیا تو حجاج مجبوراً ام البنین کے پاس گیا۔ ام البنین نے حجاج کو دروازے پر دیر تک کھڑا رکھا اس کے بعد بلا کر کہا "اے حجاج تو ابن اشعث اور عبداللہ بن زبیر کے قتل کا امیر المومنین پر احسان جتاتا ہے۔ خدا کی قسم اگر خدا تجھ کو ذلیل ترین انسان نہ خیال کرتا تو تجھ سے کعبہ کے ڈھانے اور ذات النطاقین کے بیٹے عبداللہ بن زبیر کے قتل کا کام نہ لیتا۔ عبداللہ بن زبیر اسلام میں پہلی اولاد تھی۔ رہا ابن اشعث کا معاملہ تو اس نے تجھ کو ایسی شکست دی کہ تو نے امیر المومنین عبدالملک بن مروان کی پناہ لی، اور اگر انھوں نے تیری مدد نہ کی ہوتی تو سخت ذلیل ہوتا۔ تو نے امیر المومنین

کو مشورہ دیا ہے کہ عورتوں کی صحبت میں زیادہ نہ رہیں، اگر سب عورتیں ایسی ہی اولاد پیدا کرتیں جیسے تیری ماں نے پیدا کی ہے تو امیر المومنین تیری نصیحت پر عمل کرنے میں حق بجانب ہوتے لیکن اگر عورتیں امیر المومنین ایسی اولاد پیدا کریں تو وہ تیری نصیحت کیوں سنیں -

خواجہ سرا و حرم سرا خاندان بنی امیہ میں پہلا شخص جس نے خواجہ سراؤں کو نوکر رکھا یزید بن معاویہ خیال کیا جاتا ہے، سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ میں بہت سے رومی خواجہ سرا محل میں مقرر کئے اور آئندہ یہی فتنہ وشر کا باعث ہوئے - وان کرامر کے بیان کے مطابق ولید ثانی کے وقت سے حرم سرا قایم کرنے کا رواج شروع ہوا اور بہت سی قبیح رسمیں اس کی وجہ سے رائج ہوگئیں اور مسلمان مصنفین مثلاً جاحظ وغیرہ نے نہایت سختی سے ان بری رسموں پر تنقید کی -

غلامی اور اس کا ازالہ قدیم زمانہ میں غلامی کی رسم عام تھی اور غلاموں کے ساتھ سلوک کرنے کے باب میں مختلف قوانین تھے مثلاً یہود غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے اور سات سال کے بعد اسے آزاد کر دیتے تھے رومانی قانون کے مطابق مالک کو غلام پر پورا اختیار تھا - یہاں تک کہ اس کی موت و زیست بھی مالک کے ہاتھ میں تھی - عرب میں بھی جنگی قیدیوں کو غلام بنا لیتے تھے اور ان کو بازاروں میں بیچ ڈالتے تھے - لیکن اسلام میں غلامی کا نظریہ دوسری اقوام سے مختلف تھا - اسلام میں غلام صرف وہی قیدی ہو سکتے تھے، جو ان لڑائیوں میں گرفتار ہوتے تھے جو کلمۃ اللہ کے اعلاء کے لئے لڑی جاتی تھیں - ان کو فدیہ وغیرہ لیکر آزاد بھی کر دیا جاتا تھا - رسول اکرم نے غلاموں کو بیچنا حرام قرار دیا تاکہ باپ بیٹوں سے اور بیٹے باپ سے علیحدہ نہ ہوں - متعدد احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے غلاموں سے نیک سلوک کی نصیحت فرمائی اور حکم دیا کہ غلاموں کو وہی کھلاؤ اور پہناؤ جو خود کھاتے اور پہنتے ہو - غلاموں کو آزاد کرنا قرب الٰہی کا بہترین وسیلہ قرار دیا -

لباس بدوی لباس ایک کھلی ہوئی قبا ہوتی تھی جو ایڑی تک لٹکتی تھی - کمر پر چمڑے کی پیٹی باندھتے تھے - یہی لباس بدوی عورتیں اور مرد اب بھی پہنتے ہیں - قبا کے اوپر اونٹ کے اون کی بنی ہوئی ایک عبا پہنتے تھے - سواری کا لباس مختلف تھا - سواری کے وقت ایک پاجامہ پہنتے تھے اور لٹکتے ہوئے کپڑوں کی بجائے ایک ردا یا چادر ہوتی تھی - سر کا لباس عمامہ تھا جس کا حجم سن اور علم کے لحاظ سے ہوتا تھا - ایک طیلسان یا لمبا کپڑا عمامہ کے اوپر ڈالتے تھے جو کندھوں تک لٹکتا رہتا تھا اس سے سورج کی دھوپ سے بچنا مقصود ہوتا تھا - چادریں امارت، شرف اور منصب کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھیں - قبائل کے سردار اور اکابر قوم ایسی قبائیں پہنتے تھے جو پاجامہ کے اوپر گھٹنوں تک لٹکتی رہتی تھیں، اس پر ڈھیلی چادریں ہوتی تھیں جو ایڑی تک لٹکتی تھیں بیچ میں ریشم کی پیٹی باندھتے تھے - اس کے اوپر قبا پہنتے تھے جو در اصل ایرانیوں کا طریقہ تھا - قبا دو قسم کی ہوتی تھیں - ایک تنگ آستین کی اور دوسری ڈھیلی آستین کی - ان میں بٹن قریب قریب لگے ہوتے تھے - اس قسم کی قبا آج کل بھی ایران میں بڑے لوگ پہنتے ہیں، پاؤں میں جوتے پہنتے تھے، عورتیں ایک ڈھیلی شلوار اور ایک قمیص (جو گردن پر کھلی ہوتی تھی) پہنتی تھیں - جاڑے میں اوپر سے ایک چھوٹی چادر اوڑھتی تھیں - عرب عورتیں جب باہر نکلتی تھیں تو چادریں ان کے جسم کو ڈھاک لیتی تھیں تاکہ ان کا لباس غبار اور مٹی سے محفوظ رہے - ایک رومال سر پر لپیٹ لیتی تھیں جو پیشانی پر بندھا ہوتا تھا -

کھانا عربوں کی زندگی ابتدا میں نہایت سادہ تھی - ان کی بہترین غذا گوشت تھی - شہر کے رہنے والے دیہات کے رہنے والوں سے کھانے میں عموماً زیادہ تکلف کرتے تھے -

خلفائے راشدین جیسا کہ شروع میں تذکرہ کیا گیا ہے کھانے میں کوئی اہتمام نہ کرتے تھے - جب لوگ ساتھ کھاتے تو زمین پر دسترخوان بچھایا جاتا اور دونوں طرف لوگ بیٹھ جاتے - اہل بادیہ کھانے کھلانے میں بڑے فراخدل تھے - رات کو آگ روشن کر دیا کرتے تھے کہ بھولا بھٹکا آگ کی روشنی کے ذریعہ سے ان تک پہونچ سکے - (ڈاکٹر) سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی)

ہندوستان کا ایک گمنام شاعر قلق میرٹھی

میں نے جب مومن دہلوی پر کام شروع کیا تو شاگردانِ مومن کے متعلق بھی چھان بین شروع کی اور میرے مشفق تراب علی خاں باز نے اپنے نایاب اور قیمتی ذخیرے میں سے منجملہ اور کتابوں کے دیوان قلق اور دیوان مومن مرتبۂ قلق بھی دیا، شاگردانِ مومن کی فہرست میں قلق کا نام میرے پاس تھا ضرور مگر اُن کی شاعرانہ اہمیت سے میں بالکل ناواقف تھا اب جو میں نے دیوان کا مطالعہ کیا تو آنکھیں کھل گئیں۔

قلق کے حالات کہیں نہیں ملتے آبِ حیات میں صرف اُن کا نام ملتا ہے اور اُن کے دیوان میں جو دو تقریظیں خواجہ حالی اور سید احمد دہلوی کی ہیں اُن سے کچھ حالات ملتے ہیں اس کے علاوہ کہیں بھی قلق کا نام نظر نہیں آتا۔

مولانا آزاد نے آبِ حیات میں مومن کے حالات کے سلسلہ میں جو نوٹ لکھا ہے اس میں قلق کا ذکر اس طرح ہوا ہے

"اس سلسلہ میں نواب مصطفےٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا اُن کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت تھی وغیرہ وغیرہ اس کے ساتھ اس مراسلت میں بعض اور معاملے منقول ہیں مگر ان میں بھی واردات کی بنیاد نہیں لکھی مثلاً یہ کہ مولا بخش قلق مولوی امام بخش صہبائی کے شاگرد دیوانِ نظیری پڑھتے تھے ایک دن خاں صاحب کے پاس آئے اور ایک شعر کے معنی اور نادر مطلب بیان فرمایئے کہ قلق معتقد ہو گئے اور کہا کہ مولوی صاحب نے جو معنی بتائے ہیں وہ اس سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے لیکن نہ وہ شعر لکھا ہے اور نہ معنی لکھے ہیں۔"

(آبِ حیات صفحہ ۴۳۹ و ۴۴۰ طبع دوم مطبوعہ ۱۸۸۳ء وکٹوریہ پریس)

دیوان قلق ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء میں مطبع انصاری دہلی میں رائل سایز کے (۳۸۴) صفحات پر چھپا ہے (۱۷) سطری مسطر ہے کتابت طباعت معمولی ہے، چونکہ خواجہ حالی میرٹھ میں سرکاری عربی مدرسہ کے مدرس تھے اس لئے قلق سے بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے جن کی بناء پر ایک تقریظ فارسی میں لکھی ہے ------ اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:۔

"یہ دیوانِ غرابت عنوان افاداتِ گرامی حکیم غلام مولا عرف مولا بخش قلق سے ہے جو اُردو کے مشاہیر شعراء میں سے اور خان رفیع المکان جناب غفراں مآب حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے، میرٹھ وطن تھا بارہ سال کی عمر میں میرٹھ سے دہلی گئے اور کسبِ کمال و تحصیل علم کیا غدر تک دہلی ہی میں ہے اور مدتِ طویل تک مولانا امام بخش صہبائی سے فارسی پڑھی کہتے ہیں کہ اُن کے تمام شاگردوں میں جودتِ طبع اور وحدتِ ذہن میں خصوصیت رکھتے تھے، صرف و نحو اور منطق اور دیگر فنونِ عربیہ ملا انتظام علی سہارنپوری سے حاصل کئے اور حکیم غلام نقشبند خاں سے طب پڑھی اُن دنوں جبکہ دہلی کی فصلِ بہار آخر تھی بیشتر گراں مایگانِ علم اور چابک خرامانِ عرصۂ سخن مثلاً غالب و ذوق و مومن اور دوسرے اہلِ کمال جو سخنوری اور نکتہ پروری میں فخرِ دہلی بلکہ نازشِ ہندوستان تھے، دہلی میں موجود تھے، حکیم قلق مرحوم بھی اپنی موزونیِ طبع جودتِ ذہن، فکرِ عمیق اور نظرِ دقیق کی وجہ سے اپنے آپ کو اس صحبت سے دور نہ رکھ سکے اور شاعری شروع کردی

اور مومن مرحوم کے شاگرد ہوگئے، اور رفتہ رفتہ استاد کے دل میں خاصی جگہ پیدا کرلی۔"

"مومن مرحوم جیسا کہ اُن کے دیوان سے مستفاد ہوتا ہے غزل اور دوسرے اصناف میں دو طریقے رکھتے تھے ــــ ایک عام اور دوسرا خاص، عام طریقہ وہی میر و مرزا اور دوسرے ریختہ گویوں اور استادوں کا سا تھا دوسرا طریقہ خاص انھیں کا نتیجۂ طبع اور انھیں کے لئے مخصوص ہے جو اگرچہ شاہراہ عامہ سے دور تر ہے مگر یہی اُن کی شہرت اور بلند آوازگی کا سبب ہے اور اسی سے وہ سارے ہندوستان میں اُستادی، نازک خیالی اور دقت آفرینی میں مشہور ہوئے اسی لئے مومن نے حکیم مولی بخش قلق کی مناسبت طبع اور میل خاطر اپنی طرز میں پاکر اُن پر خاص توجہ کی اور علاوہ اصلاح سخن کے القائے غوامض و دقایق فن بھی بڑے الطاف و کرم سے انھیں حاصل کرائے اور بہت کم عرصہ میں انھیں پختہ کردیا چنانچہ جہاں بھی مشاعرہ ہوتا قلق دوسرے اساتذہ کے ساتھ دادِ غزل سرائی دیتے اور حاضرین کو تعجب پر تعجب اور حیرت پر حیرت ہوتی، جب غدر کی آگ دہلی میں بھڑکی تو وہ مجبوراً میرٹھ واپس ہوگئے اور وہیں مستقلاً رہے چنانچہ ۱۲۹۷ھ میں وہیں وفات پائی، بعض سرکاری مدارس میں معلمی کرکے قلق نے زندگی بسر کی نہایت قناعت پسند، اپنے فضل و ہنر پر غیور اور مال و دولت سے مستغنی تھے شعر و سخن میں استاد اور طبابت میں بھی صاحبِ کمال تھے فرصت کا کچھ حصہ مطب کے بھی نذر کرتے تھے مرتے وقت اپنے چھوٹے بھائی کو دیوان چھپوانے کی وصیت کی تھی جس کی تعمیل اُن کے چھوٹے بھائی محمد عبداللہ نے جو انگریزی داں اور شعر و سخن سے زیادہ مانوس نہیں ہیں اس دیوان کو چھپوا کر کی ہے

گر برادراں زیشاں مہر دوستی ورزند ۔۔۔ چوں رسد بہ فرزنداں نوبتِ نکوئیہا"

یہ تین صفحات کی تقریظ خواجہ حالی نے لکھی ہے اس کے بعد سید احمد دہلوی مدرس فارسی گورنمنٹ اسکول دہلی کی تقریظ ہے جو نقل کی جاتی ہے۔

"یہ مولانا حکیم شیخ مولا بخش قلق جو میرٹھ میں اپنے شہر کا فخر اور موجودہ شعراء ہند میں ایک اعلیٰ درجہ کے نازک خیال تھے در اصل اساتذۂ دہلی کے فیض کا ایک عمدہ نمونہ تھے، درسی کتابیں آپ نے فاضل اجل جناب مولانا امام بخش صہبائی سے انکے فرزند مولوی عبدالکریم سوز کے ساتھ ہم سبق ہوکر دیکھیں، طب میں ارسطوئے زماں حکیم نقشبند خاں صاحب دہلوی سے تلمذ اور تجربہ حاصل کیا فنِ شعر میں جناب حکیم مومن خاں صاحب دہلوی سے کمال بہم پہونچایا، آپ کے شعر وہ تڑپتے ہوئے اور برجستہ ہوتے تھے کہ کیسا ہی ٹھنڈی طبیعت کا آدمی کیوں نہ ہو تڑپ ہی جاتا تھا، عجب نہیں جو بعض اوقات مولانائے ممدوح کو خود بھی اپنے اشعار پر رشک آجاتا ہو، استاد اور شاگرد میں جو ایک خاص نسبت ہونی چاہئے وہ آپ میں اور حضرت مومن خاں میں بخوبی موجود ہے کوئی بڑا ہی صاحبِ مذاق ہو تو شاید یہ کہ سکے کہ اشعار تو مومن خاں کے ہیں مگر البتہ ابتدا اور انتہا کا کہیں کہیں فرق ہے ورنہ ہر ایک کا کام نہیں ہے کہ مومن اور قلق کے سخن میں تمیز کرسکے ان کے تڑپتے ہوئے اشعار ان کی طبیعت کی شوخی زبان کی سلاست خیال کی نزاکت۔ اور صنایع شعری پر خود گواہ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"چونکہ آپ کی عمر نے ابھی دوسرا ہی مرحلہ طے کیا اس سبب سے ترتیب دیوان کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی تھی مگر دوست احباب کے تقاضے سے تنگ آکر مرنے سے چند روز پہلے جیسا بنا جوں توں کرکے ترتیب دے لیا تھا ابھی چھپنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ قضائے ناگہانی نے بیوقت آن دبایا"

معلوم نہیں کس جگہ مگر کہیں میں نے دیکھا ہے کہ مومن کے انتقال کے وقت قلق کی عمر اکیس برس کی تھی مومن نے ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا ہے اس طرح قلق کی ولادت ۱۲۴۷ھ کی قرار دی جاسکتی ہے اور ان کی آمد دہلی میں ۱۲۵۹ھ سمجھی جاسکتی ہے اور انتقال کے وقت یعنے ۱۲۹۷ھ میں عمر پچاس سال قرار پاتی ہے یہ اندازہ صحیح بھی ہے کیونکہ سید احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ

"آپ کی عمر نے ابھی دوسرا ہی مرحلہ طے کیا تھا" یعنے عمر پچاس سال کی ہوئی تھی۔
دہلی میں قلق نے صہبائی سے اُن کے چھوٹے فرزند عبدالکریم سوز کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی اور دونوں میں بڑی محبت تھی خمخانۂ جاوید میں سوز کے حالات میں لکھا ہے کہ :-

"مولا بخش قلق میرٹھی مرحوم جو حضرت صہبائی کی شاگردی سے پھر کر جناب مومن کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے تھے اُن سے کارزار شاعری میں مقابلے ہوئے قلق کو زاردحزیں ہونا پڑا ہنگامۂ سخن میں اُن کے آگے قدم نہ جمے"

(خمخانۂ جاوید جلد ۴ صفحہ ۸۸۳)

عبدالکریم سوز، قلق کے ہم عمر تھے ممکن ہے کہ صہبائی سے پڑھنا چھوڑ کر مومن کے پاس قلق کا جانا سوز کو ناگوار گزرا ہو اور چند روز ان دونوں میں اختلاف رہا ہو مگر قلق کی وجہ سے صہبائی اور مومن کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا اور وہ دونوں حسب سابق ایک دوسرے کے مخلص اور دوست تھے، قلق کے دیوان میں سوز کے انتقال کی تاریخ کہیں نظر نہیں آتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلق اور سوز میں آخر زمانہ میں کچھ خلوص باقی نہ رہا تھا ورنہ ۱۲۷۲ھ میں سوز گوروں کے ہاتھ دہلی میں بے گناہ مارے گئے ان دنوں قلق زندہ تھے اور غالباً دہلی ہی میں تھے پھر سوز کی تاریخ وفات وغیرہ نہ کہنا کیا بات اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن دونوں میں صفائی باقی نہ تھی، دیوان قلق میں صرف دو رباعیاں سوز کے متعلق ہیں جو ابتدائی زمانے کی ہیں، آپ بھی سُن لیجئے :-

وہ ایک مہینے کے لئے کیا بچھڑے، جو اُٹھ نہ سکے حادثے وہ مجھ پہ پڑے
جنبش نہ کرے گا یہ مہینہ صد سال اے چرخ عجب پیچ سے ہفتے جکڑے

اے صلِ علیٰ سوز ترا حسن و جمال، یہ مہر میں خوبی ہے نہ یہ مہ میں کمال،
کاہش کے سوا کچھ نہیں افزائش میں تو بارہ برس کا رہے یارب صد سال

اطبائے یونان کے متعلق مشہور ہے کہ جو حکیم جس مرض کا معالج خصوصی تھا اُسی مرض میں خود مبتلا ہوکر مرا ہے یہی حال قلق کا بھی ہوا ہے چونکہ بڑے اچھے حکیم اور ماہر طبیب تھے اس لئے مرضِ سل میں مبتلا ہوکر مرے چنانچہ حافظ محمد امداد حسین ظہور میرٹھی نے قطعۂ تاریخ وفات میں اس کی صراحت کی ہے اور یہ قطعہ دیوان قلق کے ساتھ چھپا ہے :-

قلق شاعرے خوش گپ و خوش خصال ز دنیا سوئے دار جنت برفت
بہ بیماریِ سل کہ بُد جاں گسل بہ تسلیم شاد و بہجت برفت
سروش از پئے سال گفت از ظہور قلق شاعر ما بجنت برفت
۱۲۹۷ھ

آپ شاید یہ سمجھیں کہ قلق کو سل کی بیماری خاندانی ہوگی مگر ایسا نہیں ہے، یہ سل ان کو افلاس و تنگ دستی آلام و افکار کی وجہ سے ہوگئی تھی، چنانچہ ان کے کلام سے خود اس کی تفصیل ملتی ہے، ایک رباعی "غمِ نان" میں کہی ہے :-

بے برگ و نوا کی شعر خوانی معلوم بے دانہ و دام نکتہ دانی معلوم
جس کی کہ غمِ نان ہی غذا ہو اس کی میدانِ سخن میں پہلوانی معلوم

ان آلام و افکار نے ان کی طبیعت میں قنوطیت پیدا کردی تھی چنانچہ کہتے ہیں :-

ہر شاخ پہ آشیاں ہے لرزاں اس باغ میں ہو چکا گزارا
کیوں موت کے آسرے پہ جیتے اے زیست ہمیں تو تو نے مارا

غم بھی کھانے کو نہ جی بھر کے میسر آیا — تہی کاسۂ تقدیر سے دل بھر آیا
حیف خمیازہ ہائے حسرت و شوق — زندگانی کشاکشی ہی سہی

دیوان قلق ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے صرف چند شعر نقل کئے گئے ہیں، قلق نے شادی نہیں کی تھی، بھائی میرٹھ میں تھے تو ان کے ساتھ رہتے جب وہ اپنی ملازمت کی وجہ (کیونکہ وہ محکمۂ نہر کے سپروائزر تھے) سے کہیں چلے جاتے تو تنہا رہتے تھے۔ قلق نے مومن، غالب، میر سبھوں کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں مگر رنگ وہی مومن کا ہے، ایک مصرع عام طور پر مشہور ہے اور میں بچپن سے سن رہا ہوں آپ نے بھی سنا ہوگا ؎ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" مگر کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ مصرع قلق کا ہے، اور اُن کی ایک قطعہ بند یعنے مسلسل غزل کے مقطع کا مصرعِ ثانی ہے یہ قطعہ لمبا ضرور ہے مگر پُر لطف ہے اس لئے نقل کرتا ہوں، سنئے :-

شب سرِ شوریدہ بالیں پہ مرے یکجا نہ تھا — دل میں تھا اک جوش لب پر نالۂ مستانہ تھا
حسرتِ خوابیدہ کیا کیا چونکتی تھی سینے میں — دل میں جوں جوں شور افغاں ہائے بیتابانہ تھا
عاقبت کی چشم پوشی چشم نے اس حال سے — اور غفلت یہ ہوئی طاری کہ ہوش اصلا نہ تھا
لے اُڑی پھر وحشت گردی خواب میں سوئے چمن — اور چمن بھی وہ کہ آزادوں کا دام و دانہ تھا
سیر کرتے کرتے جب آگے بڑھا دیکھا وہاں — شکل میں عشرت کدہ کی ایک حیرت خانہ تھا
اک طرف سے اُڑ رہی تھی اور ہزاروں خم کے خم — کوئی بیخود کوئی بیتاب اور کوئی مستانہ تھا
نغمہ برلب جام برکف دل نگار آتشیں — سب محبت کیش تھے کیا حلقۂ رندانہ تھا
اور اک جانب کو حلقہ زن تھے چندیں شمع رو — مہر جن کے سامنے خاکسترِ پروانہ تھا
جس طرف کو ہنس دیا میدانِ محشر ہوگیا — پھر گئیں نظریں جدھر یک لخت سب ویرانہ تھا
اُن میں سے اک فتنہ گر اُٹھ کر بڑھا میری طرف — زلف تھی رخ پر پریشاں ہاتھ میں اک شانہ تھا
خود بخود پہلو میں آبیٹھا کچھ ایسے ناز سے — گویا وہ غارت گرِ دل میرا ہی دردانہ تھا
اور لگا کہنے کہ گیسو تو ذرا سلجھا مرا — اس طرح سلجھا کہ یہ گویا کہیں اُلجھا نہ تھا
زلف چہرے سے سرکتے ہی موذن چیخ اُٹھا — آنکھ پٹ سے کھل گئی ایسی کہ میں سویا نہ تھا

پھر وہی دل تھا وہی ماتم وہی درد و قلق،
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اُردو شعراء میں سب سے پہلے مومن ہی نے مسلسل اور قطعہ بند غزلیں کہی ہیں ورنہ ان سے پہلے اور ان کے معاصرین مسلسل غزلیں نہیں کہا کرتے تھے، مومن کی اتباع قلق نے کی ہے اور اکثر غزلیں مسلسل کہی ہیں جن میں سے ایک آپ نے بھی سن لی، قلق نے مومن کی پوری خصوصیات کو بڑی خوبی سے "اپنایا" ہے ذیل کے شعر اس کا بہترین نمونہ ہیں،

جی کا جی ہی میں رہا حرفِ تمنا افسوس — کہنا کچھ آپ ہی اور آپ پشیماں ہونا
ہمیں کیوں دل دیا اور دلربائی دلمیں کیوں کی تھی — خدا دشمن بتوں کی بندگی سے ہو نہیں سکتا
کریں وہ پاک قصہ یہ نزاکت سے نہیں ممکن — اٹھاؤں ہاتھ یہ بے طاقتی سے ہو نہیں سکتا
جب نقد حسن رونقِ بازار ہوگیا — سودائے ناقبول خریدار ہوگیا،
وہ ہے قابو میں تو قابو نہیں اپنے اوپر — کب گئے ہوش کہ جب سامنے دلبر آیا

وہ ہی ہیں وہ ہی فلک وہ ہی عدو وہ ہی نصیب
جانے کیا حادثہ ہے کیوں وہ مرے گھر آیا

تا داستانِ وصل تو غمخوار تھے حریف
جب دردِ دل کہا تو کوئی درمیاں نہ تھا

حیف وہ نوحہ کہ دل میں آتے ہی نغمہ ہوا
ہائے وہ نغمہ جو آکر لب پہ شیون ہوگیا

اس کی بیداد میں بھی لطف کا ساماں ہوگا
سر نہ ہونے کا بھی سر پہ مرے احساں ہوگا

گو غیر ہی کی ہو مگر اُلفت کا اعتبار،
ظالم ترے یقین کا مجھ کو گماں نہ تھا

نہ لگتی آنکھ تو سونے میں کیا برائی تھی
خبر جو آپ کی ہوتی تو بے خبر ہوتا

قطعے تقریب عیادت کی بھی امید ہوئی
ہوگیا اور بھی بیمار میں اچھا ہوکر

نالہ کرتا ہوں لوگ سنتے ہیں
آپ سے کچھ مرا کلام نہیں

یوں تو وہ عالم آشنا ہے مگر
اک مجھی سے ذرا لڑائی ہے

وہی رنج ہے تو یوں ہی سہی وہ قلق ہی تھا کہ یونہی سہی
مری آپ کو بھی ہے بندگی مرا عشق کو بھی سلام ہے

یہ ہے کہ ہوگا داورِ محشر بھی محوِ خواب
کہنی پڑے گی ساری تری داستاں مجھے

مومن نے نقشِ پا پر سجدہ کرتے ہوئے کوچۂ رقیب میں بھی گزر کیا تھا اور اس کو اپنی ذلت سمجھتے تھے مشہور شعر ہے:-

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا، کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مگر قلق، مومن سے بھی بڑھ جاتے ہیں ایک ایک نقشِ پا پر کئی کئی سجدے کرکے نقشِ پا مٹا دیتے ہیں۔

کثرتِ سجدہ سے پشیماں ہیں،
کہ ترا نقشِ پا مٹا بیٹھے

مشتے نمونہ از خروارے چند شعر میں نے نقل کئے ہیں اس سے اندازہ لگائیے کہ قلق نے مومن کا رنگ کتنا اُڑایا تھا نہ صرف تخیل اور طرزِ ادا بلکہ استعارات، تشبیہات، تراکیب بھی مومن ہی کے استعمال کرتے ہیں چند اس قسم کے شعر بھی ملاحظہ فرمائیے:-

لو جوششِ قہر شوقِ ترحم میں آگیا
ثابت ہوا گناہ نہ کرنا قصور تھا

کوششِ پردہ عبث حوصلۂ دید کسے
جلوہ کیا کم تھا اگر منہ ہی چھپانا ہوتا

یا نہ ہوتی تھی چرخ کو گردش
یا مجھی پر مدار ہوتا تھا

پردہ داری عشق میں پردہ دری سے کم نہیں
میرا اندازِ خموشی خود فغاں ہوجائے گا

جیتے رہے ہیں مردنِ دشوار کے لئے
مرتے رہے ہیں گو سبھر اندازِ یار پر

ہے طرزِ محبت ہی دل آشوب وگرنہ
کچھ بات عداوت کی نہ تم میں ہے نہ ہم میں

اب تک آپ نے متفرق شعر ملاحظہ کئے ہیں اور صرف ایک قطعہ بند اور مسلسل غزل دیکھی ہے اب چند غزلوں میں سے چیدہ چیدہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے تاکہ آپ قلق کی شاعری کا صحیح اندازہ کرسکیں یہ اشعار بلا انتخاب ہر ایک غزل میں سے نقل کئے جارہے ہیں تاکہ آپ کو قلق کا عام رنگ معلوم ہوسکے۔

اللہ ری دشمنی مرے حالِ تباہ پر
اعدا ابھی رو چکے وہ نہیں شاد ماں ہنوز

بے التفاتیوں میں بھی اک التفات ہے
ہے نذرِ نیم ناز مری نیم جاں ہنوز

اس قدر ہوگئے ہم زیست سے ناچار کہ بس،
چارہ سازوں سے طبیعت ہے یہ بیزار کہ بس

میرا ہر لفظ پہ یہ ذہن پریشاں کہ نہ پوچھ
اس کو ہر بات پہ اس مرتبہ تکرار کہ بس

نہ اسے پاس ہے میرا نہ حیا ہے اس کو
دلِ خود کام بھی ہے اتنا خود آزار کہ بس

رحم سے تیری وہ دلگیر اجل ہے کہ پناہ
مرگ سے میرے وہ شرمندہ ہے آزار کہ بس

کرلیا سارے زمانے کو قلق نے دشمن
کیا بلا نشۂ الفت میں ہے سرشار کہ بس

عشق کو منظور رسوائی دروغ
حسن کو پاسِ حیاداری غلط

رہ گئے ہم آسماں کو دیکھ کر
اس کا آشوب ستمگاری غلط

نام لے کر تیرا رو پڑنا صحیح
دل کو دے کر گریہ وزاری غلط

ملتے ہیں تیرے واسطے اب مدعی سے ہم
پھرتے ہیں کیسے کیسے خوشی ناخوشی سے ہم

کیا ایسے ہی ذلیل تھے پہلے بھی چاہ سے
احوال اپنا پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

یاد آگئیں جو شب کو تری بے حجابیاں
سایہ میں اپنے چھپ گئے شرمندگی سے ہم

قلق، مومن کے نہ صرف تبع ہی تھے بلکہ انھوں نے اپنے آپ کو مومن کے رنگ میں رنگ لیا تھا اور یہ رنگ اتنا گہرا تھا کہ آپ مومن اور قلق میں مشکل سے تمیز کر سکتے ہیں مگر مومن کی طرح قلق نرے شاعر نہ تھے بلکہ ماحول سے متاثر ہونے والے اور پکے دنیا دار قسم کے آدمی تھے، دنیا کی پوری دلچسپیوں میں حصہ لیتے تھے اور میلے ٹھیلے تک جاتے آتے تھے چنانچہ نوچندی کے میلے کا حال سنئے

نوچندی کے میلے کا نہ پوچھو کچھ حال
ہوں دیکھ کے حیران کہ دوں کس سے مثال

یا روضۂ رضوان ہے سادا سا مکان
یا سیر سے میرا ہی منقش ہے خیال،

قلق نے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، نواب کلب علی خاں والیِ رام پور، حیات خاں، رابرٹ جارج گرے، وغیرہ کی تعریف میں قصاید اور چند قطعات بھی کہے ہیں۔ قلق کے قصاید میں کوئی خاص بات نہیں مومن خاں کی طرح قصیدے میں غزل کا رنگ پیدا ہے شیفتہ کی مدح میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں غزل بھی کہ ڈالی ہے نمونتہً دو تین شعر آپ بھی سُن لیجئے:۔

نہ دے فریبِ اثر مجھ کو نالۂ ناشاد
کہ یار حیلۂ طلب بخت بد فلک بیداد

نہ پوچھ چرخ سے تقریب حشر و نشر نہ پوچھ
کہ میری خاک کو کرنا ہے عاقبت برباد

تجھے بھی روئے بنی بات بات پر ظالم
تری زبان ہو اور کاش ہو مری روداد

البتہ ایک قصیدۂ لامیہ جو کلب علی خاں کی مدح میں کہا ہے اپنے رنگ سے ہٹ کر کہا ہے اور (۱۵۸) شعر کا طویل قصیدہ بڑا مکمل ہے جس کا مطلع ہے:۔

تیغ خورشید حمایل کئے بیٹھا ہے حمل
خیمہ گاہِ دے وبہمن میں پڑی ہے ہلچل

ایک واسوخت (دشمن) بھی بڑی اچھی کہی ہے، ایک بند آپ بھی سُن لیجئے:۔

اے خانہ بر انداز حیا ہم سے پھرا تو
پامال کیا نقشِ وفا خوب کیا تو

کس خاطر ناکام کا آرام ہوا تو
رنگ رخ مایوس کے مانند اُڑا تو

کیا کام ہے دل میں اگر آنکھوں سے چھپا تو
ارماں کی طرح پھر کے نہ آنے سے بھی جا تو

جیتے ہیں تو مقدور تلک صبر کریں گے
مجبور سہی دل پہ مگر جبر کریں گے

یہ واسوخت بہت طویل (۷۰) بند کی ہے۔ مرثیہ بھی قلق نے کہا ہے مگر کوئی خاص بات پیدا نہ کرسکے، اسی طرح چند قطعات اور رباعیات بھی دیوان میں ہیں مگر اُن میں کوئی خاص بات نہیں۔

تمکین کاظمی

اسٹالین اور ویلز کی تاریخی ملاقات

فلسفۂ اشتراکیت ایک ماہر اشتراکیت کی زبان سے

حال ہی میں امریکہ میں ایک کتاب شایع ہوئی ہے جس کا نام ہے The Great Conversation اس میں وہ تمام ریکارڈ کی ہوئی گفتگو درج ہے جو اسٹالین اور اچ۔ جی ویلز کے درمیان ہوئی تھی، اس میں شک نہیں کہ ۲۳ جولائی ۱۹۳۴ء اچ جی ویلز کی زندگی کی بڑی اہم تاریخ ہے جب پہلی بار اسٹالین سے ملنے اور دیر تک نظریۂ مارکسیت پر گفتگو کرنے کا موقع اسے ملا۔ یہ ملاقات تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی جس میں ویلز اور اسٹالن دونوں نے دل کھول کر اپنے زاویۂ نگاہ کو پیش کیا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ویلز اس کے بہت گہرے اثرات لیکر ماسکو سے واپس آیا۔

ہم اسٹالن اور ویلز کی اسی گفتگو کا ضروری اقتباس اس جگہ پیش کرتے ہیں کہ جس سے دنیا کے معاشرۂ مستقبل کے متعلق اسٹالین ایسے خاموش اور گہرے انسان کا صحیح نقطۂ نظر معلوم کرنے میں ہم کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔ (نیاز)

ویلز:۔ مسٹر اسٹالین، میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے تبادلۂ خیال کا موقع دیا۔ میں حال ہی میں امریکہ گیا تھا اور وہاں پریسیڈنٹ روزولٹ سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے ان کے صحیح خیالات معلوم کئے اب میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں تاکہ یہ معلوم کروں "آپ کیا کرنا چاہتے ہیں" لیکن یہ واضح رہے کہ میں یہ تمام معلومات اس وقت ایک عام انسان کی حیثیت سے حاصل کرنا چاہتا ہوں، کسی سیاسی فریق کے کارکن ہونے کی حیثیت سے نہیں۔

امریکہ جانے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہاں بڑا اقتصادی انقلاب پیش نظر ہے، پرانا مالیاتی نظام ختم ہو رہا ہے اور ملک کی اقتصادی زندگی کو بالکل نئے سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔ لینن کا قول تھا کہ "ہم کو کاروبار سرمایہ داروں سے سیکھنا چاہئے" لیکن آج سرمایہ دار آپ سے پوچھنا چاہتا ہے کہ سوشلزم کی صحیح روح کیا ہے۔

اس وقت امریکہ میں تنظیم جدید کا کام پوری قوت کے ساتھ جاری ہے، اور اشتراکیت کی سطح پر وہاں کے اقتصادیات کو لایا جا رہا ہے گویا آپ اور روزویلٹ ایک ہی منزل تک دو مختلف راستوں سے پہونچنا چاہتے ہیں جو کچھ میں نے واشنگٹن میں دیکھا وہی یہاں بھی دیکھ رہا ہوں، منصوبہ بندیوں کے تحت نئے نئے دفاتر کا قیام مروجہ قوانین و قواعد میں مناسب تبدیلیاں، سول سروس کے نظام کی جدید تنظیم میں عملی اہلیت کا خاص لحاظ۔ یہ تمام باتیں آپ کے یہاں بھی ہیں اور وہاں بھی، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ واشنگٹن اور ماسکو کے درمیان اتحاد خیال کی بنا پر کوئی اختلاف نہ ہونا چاہئے۔

اسٹالین:۔ "ہمارے اور امریکہ کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے، امریکہ اقتصادی خطرات سے بچنے کے لئے جو کچھ کر رہا ہے اس کی بنیاد بدستور سرمایہ دارانہ جد و جہد پر قایم ہے اور وہ بنیادی طور پر اپنے اقتصادی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتا ـــــ ــ ــ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ موجودہ اقتصادی

نظام سے جو نقصان اُس کو پہونچ رہا ہے اس کو وہ بڑی حد تک کم کردینا چاہتا ہے۔ ہمارے یہاں صورت بالکل دوسری ہے اور ہم پُرانے اقتصادی نظام کو باقی رکھنا ہی نہیں چاہتے اور ایک نیا نظام بالکل نئے زاویہ سے قایم کرنا چاہتے ہیں۔

امریکہ کی جدید اقتصادی اسکیم کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ پیداواری نظام میں انارکی پیدا ہوجائے گی کیونکہ وہ پرانے سوشل نظام کو بدلنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی مضرتوں کو صرف کم کردینا چاہتے ہیں، برخلاف اس کے ہمارے اقتصادی نظام کا مقصود یہ ہے کہ بیکاری کو یک لخت دور کر دیا جائے اور اس میں صرف اسی وقت کامیابی ہوسکتی ہے جب سرمایہ داری کو بالکل مٹا دیا جائے۔ سرمایہ دار کبھی اس بات پر راضی نہیں ہوسکتا کہ بیکاری کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کو سستے مزدور اسی وقت مل سکتے ہیں جب ملک میں بیکاروں کی کافی تعداد موجود ہو۔

ہمارے اقتصادی نظام کی روح یہ ہے کہ ملک میں صرف ان صنعتوں کو فروغ دیا جائے جو عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہیں خواہ ان میں نفع ہو یا نہ ہو، برخلاف اس کے امریکہ کا سرمایہ دار کبھی اس بات پر راضی نہ ہوگا کہ وہ کسی ایسی صنعت کو فروغ دے جس میں اس کو معقول نفع نہ ہو۔ اسی لئے میں نے کہا کہ جب تک ذاتی ملکیت اور سرمایہ داری کو بالکل ختم نہ کردیا جائے عوام کے لئے واقعی کوئی اقتصادی نظام مرتب نہیں ہوسکتا۔"

ویلز:۔ "آپ نے جو کچھ کہا میں اس سے بڑی حد تک متفق ہوں، لیکن اگر امریکہ اپنے موجودہ اقتصادی نظام کو دفعتًا بدلنے کے بجائے اس میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا کرے اور آخر میں وہ سوشلزم کے حدود تک پہونچ جائے تو اس میں کیا حرج ہے مسٹر روز ویلٹ کی جدید اقتصادی اسکیم بھی دراصل سوشلزم ہی تک پہونچتی ہے۔ اور یہ آپ کے ان کے درمیان ایسا مشترک نقطہ ہے جس پر دونوں متحد ہوسکتے ہیں۔"

اسٹالین:۔ "میں مسٹر روز ویلٹ کی نیت اور ان کی ہمت وجرائت کا مداح ہوں اور جانتا ہوں کہ اس وقت سرمایہ دارانہ نظام کی دنیا میں ان کی ذات سے کچھ توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ لیکن جب تک حالات موافق نہ ہوں اور ماحول مساعد نہ ہو روز ویلٹ بھی کیا کرسکتے ہیں۔

جس حد تک نظریہ کا تعلق ہے ہوسکتا ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو باقی رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اس منزل کو پالیا جائے جسے اینگلو سیکسن اقوام اپنی زبان میں سوشلزم کہتی ہیں، لیکن عملًا یہ بہت دشوار ہے کیونکہ جس وقت روز ویلٹ یا کوئی اور سرمایہ داری کے خلاف کوئی موثر قدم اُٹھائے گا تو بورژوا طبقہ فورًا مخالف ہوجائے گا اور کامیابی ناممکن ہوجائے گی۔ امریکہ کے بنک، صنعتی کارخانے، بڑے بڑے فارم، ریلوے کمپنیاں اور تجارتی جہازوں کے بیڑے روز ویلٹ کے ہاتھ میں نہیں ہیں بلکہ یہ سب سرمایہ داروں کی ذاتی ملکیت ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ ان تمام اداروں، کارخانوں اور کمپنیوں میں کام کرنے والے ماہرین فن روز ویلٹ کا کہنا نہیں مانیں گے بلکہ وہی کریں گے جو ان کے مالک چاہتے ہیں، اور ان کے یہ مالک کبھی پسند نہ کریں گے کہ ان کی دولت میں عوام شریک ہوجائیں۔ ان حالات میں سرمایہ دار حکومتوں کی حیثیت دراصل محض ایک محافظ یا سپاہی کی سی ہے جس کا کام صرف یہ ہے کہ ملک میں بد امنی نہ ہونے دے اور اگر کوئی دوسرا ملک حملہ آور ہو تو مدافعت کرے اور اپنی اس خدمت کا معاوضہ وہ ٹیکس کے ذریعہ سے وصول کرتا رہے۔

سرمایہ دار ممالک اقتصادی و معاشی نظام میں کوئی تبدیلی کرہی نہیں سکتے کیونکہ وہاں کی حکومتیں سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ میں ہیں اور یہ طبقہ کوئی ایسا معاشی نظام پسند ہی نہیں کرسکتا جو فرق مراتب کا دور کرنے والا ہے۔ اسی لئے میں نے کہا کہ مسٹر روز ویلٹ بھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ہوسکتا ہے کہ کئی نسلوں کے بعد آہستہ آہستہ کوئی تدریجی ترقی ہوسکے، لیکن حقیقی منزل تک پہونچنے کا امکان پھر بھی بہت کم ہے۔

ویلز :- "موجودہ سائنس کی ترقی نے امریکن آبادی کی ذہنیت میں بھی بڑا انقلاب پیدا کردیا ہے اور انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے معاشی نظام کی تبدیلی کو ایک میکانکی ضرورت تسلیم کیا جاتا ہے - فرض کر لیجئے کہ وہاں بنکوں کا انتظام اور مصنوعات کی نقل و حرکت کا اہتمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیلے تو اس کے معنے بھی یہی ہوں گے کہ ان کی ملکیت حکومت کے ہاتھ آگئی اور اس طرح اشتراکی تنظیم کا آغاز ہوجائے گا۔ سوشلزم اور انفرادی ملکیت سفید و سیاہ کی طرح ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان کچھ ایسی منزلیں بھی پائی جاتی ہیں جہاں دونوں کا اشتراک ممکن ہے، مثلاً اگر ایک خاص نہج پر معاشی تنظیم کیجائے تو وہ سوشلزم ہی کی مترادف ہوسکتی ہے۔

جدید معاشی تنظیم بڑی حد تک ماہرین فن کی اعانت پر منحصر ہے اور ماہرین رفتہ رفتہ سوشلزم کے اصول پر کام کرنے کے لئے مایل کئے جاسکتے ہیں"

اسٹالین :- "یہ صحیح ہے کہ فردیت (Individualism) اور اجتماعیت (Collectivism) کے درمیان کوئی ایسا فرق نہیں ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نہ مل سکیں، کیونکہ اجتماعی مفاد انفرادی مفاد بھی ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو سوشلزم کا تصور انفرادی مفاد کے تصور سے علحدہ ہو ہی نہیں سکتا، لیکن اصل سوال تو طبقاتی تفاوت کا ہے - ایک طبقہ سرمایہ والوں کا ہے، دوسرا ملکیت رکھنے والوں کا اور تیسرا مزدوری محنت کرنے والوں کا جسے پرولتاری طبقہ کہتے ہیں۔

اول الذکر دو طبقے وہ ہیں جو بنکوں، کارخانوں، معدنوں، فارموں اور نوآبادیوں کے مالک ہیں، اور صرف اپنے نفع کو دیکھتے ہیں، پرولتاری طبقہ غریبوں کا ہے جو اپنی قوتِ عمل کو فروخت کرنے کے بعد بھی ضروریاتِ زندگی فراہم نہیں کرسکتا۔ پھر کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان کبھی اتحاد و اتفاق ہوسکتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ روز ویلٹ اس طبقاتی کشمکش کو دور کرنے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوئے اور نہ آیندہ ہوسکتے ہیں، ہر چند میں خود امریکہ کبھی نہیں گیا اور وہاں کے حالات مجھے صرف اخبارات و رسایل یا کتابوں کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں تاہم چونکہ میں سوشلزم کے لئے جہاد کرچکا ہوں، اس لئے سمجھ سکتا ہوں کہ اگر روز ویلٹ نے کبھی حقیقی معنی میں پرولتاری طبقہ کے مطالبات پورے کرنا چاہئے تو سرمایہ دار طبقہ فوراً روز ویلٹ کی جگہ دوسرا پریسیڈنٹ مقرر کرے گا اور کہے گا کہ پریسیڈنٹ تو آتے ہی جاتے رہتے ہیں، ہم کیوں کسی کے لئے اپنے مفاد کی قربانی کریں"۔

ویلز :- انسانیت کی جو سادہ تقسیم آپ نے امیر و غریب جماعتوں میں کردی ہے، اس سے مجھے اختلاف ہے، وہاں ایک جماعت یقیناً ایسی ہے جس کا مقصود صرف مادی منفعت حاصل کرنا ہے، لیکن ان کو وہاں بھی بُرا سمجھا جاتا ہے۔ وہاں بہت سے دولتمند ایسے بھی ہیں جن کا مقصود صرف دولت جمع کرنا نہیں، بلکہ اس کو پھیلاکر اپنے نفع کے ساتھ دوسروں کو نفع پہونچانا ہے علاوہ اسکے وہاں ایک معقول جماعت ایسے لوگوں کی بھی ہے جو موجودہ معاشی نظام سے مطمئن نہیں ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جو مستقبل کا سوشلسٹ نظام استوار کرنے میں نمایاں حصہ لے سکتے ہیں، چنانچہ پچھلے دو سال کے اندر میں نے ان ٹکنکل ماہرین کے درمیان رہ کر سوشلزم کا کافی پروپیگنڈا کیا ہے، لیکن ان کے سامنے اس مسئلہ کو صرف "امیر و غریب" کی تقسیم کی حیثیت سے پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا"

اسٹالین :- اس میں شک نہیں کہ امیر و غریب کے درمیان ایک اوسط طبقہ بھی ہے، ٹکنکل ماہرین کی بھی ایک جماعت ہو لیکن ان کے وجود سے "امیر و غریب کی تقسیم" پر کوئی اثر نہیں پڑتا - کیونکہ اوسط طبقہ جن میں کچھ اچھے ہیں اور کچھ بُرے، کبھی سرمایہ داروں کے ساتھ ہوجاتا ہے اور کبھی طبقۂ عمال کے ساتھ - اس لئے وہ کوئی تیسرا علحدہ طبقہ نہیں - اصل اختلاف تو در اصل سرمایہ دار اور مزدور جماعت کے درمیان ہے اور وہ بدستور قایم رہے گا۔ اوسط طبقہ کا وجود اس اختلاف کو وسیع تو کرسکتا ہے لیکن دور نہیں کرسکتا"

ویلز: ۔ "مگر بہت سے ایسے لوگ بھی تو ہیں جو غریب نہیں ہیں لیکن کام میں لگے ہوئے ہیں اور ملک کی پیداوار بڑھا رہے ہیں"۔

اسٹالین: ۔ "ہاں چھوٹے چھوٹے زمیندار، تاجر اور صناع اس قسم کے ضرور موجود ہیں، لیکن ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنا ان کے ہاتھ میں نہیں، یہ فیصلہ تو عمال کے ہاتھ میں ہے جو اپنی محنت سے سوسائٹی کی ضروریات فراہم کرتے ہیں"۔

ویلز: ۔ "سرمایہ داروں کی بھی تو قسمیں ہیں، بعض ایسے ضرور ہیں جن کا نقطۂ نظر صرف دولت اور نفع حاصل کرنا ہے لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن کا مقصود یہ نہیں، کیا راکفلر اور فورڈ کی زبردست تنظیمی اہلیت سے انکار کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں، یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ سوویٹ حکومت کے متعلق انگریزی بولنے والی قوموں کی رائے میں نہایت اہم تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ ہر چند اس کا بڑا سبب جاپان کی پوزیشن اور جرمنی کے حالات ہیں لیکن ان کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی ہیں جو بین الاقوامی سیاست سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں میں سے ایک پرائیویٹ نفع اندوزی کے طریقہ کو بُرا سمجھنے کا رجحان بھی ہے۔ اس لئے ان حالات میں مناسب نہیں کہ آپ کی دنیا اور مغرب کی دنیا میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو، میں جانتا ہوں کہ پُرانا طریق کار جلد ختم ہونے والا ہے لیکن شاید آپ ایسا نہیں سمجھتے"۔

اسٹالین: ۔ "آپ نے جن سرمایہ داروں کی تنظیمی اہلیت کا ذکر کیا ہے، ان کی خدمات کا مجھے بھی اعتراف ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ بھی نفع اندوزی کا کسی نہ کسی صورت سے ساتھ دے رہے ہیں۔ آپ نے فورڈ کا ذکر کیا۔ یقیناً وہ بڑی زبردست تنظیمی اہلیت رکھتا ہے، لیکن عمال کے ساتھ جو اس کا طرز عمل ہے کیا آپ اس سے واقف نہیں، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ وہ جب چاہتا ہے کام کرنے والوں کو کارخانہ سے نکال کر باہر کر دیتا ہے۔ سرمایہ دار خواہ کسی قسم کا ہو نفع اندوزی کے خیال سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا اور دنیا کی کوئی قوت اس کے اس رجحان کو بدل نہیں سکتی۔

باور کیجئے کہ سرمایہ داری کو نہ تنظیمی اہلیت رکھنے والے دور کر سکتے ہیں نہ صناعوں اور ماہرین فن کا طبقہ۔ یہ کام طبقۂ عمال ہی کر سکتا ہے کیونکہ صناعوں اور ماہرین فن کی جماعت بھی آزاد نہیں ہے اور وہ اپنے سرمایہ دار مالکوں کی مرضی کے مطابق کام کرنے پر مجبور ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ٹکنکل ماہرین کی جماعت بعض حالات میں یقیناً بڑا کام کر سکتی ہے، لیکن اس سے نقصان بھی پہونچ سکتا ہے۔ اکتوبر کے انقلاب کے بعد ہمارے یہاں کی ٹکنکل جماعت نے نئی سوسائٹی کی تنظیم میں ہمارا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور ہم بڑی مشکل سے انھیں راہ راست پر لا سکے لیکن جب وہ ہمارے ساتھ ہو گئے تو اس میں شک نہیں کہ ان کی مدد سے ہم کو بہت فائدہ پہونچا۔ لیکن آپ کے یہاں اس جماعت کو دفعتاً سرمایہ داری کے چنگل سے آزاد کرانا آسان نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انگلستان اور فرانس کے ماہرین فن اس پر راضی ہو جائیں گے کہ سرمایہ داروں کے مقابلہ میں طبقۂ عمال کا ساتھ دیں، وہ مشکل ہی سے سرمایہ داروں کا ساتھ چھوڑنے پر راضی ہوں گے کیونکہ وہ خود بھی ذاتی منفعت کے خیال سے متاثر ہیں۔

علاوہ اس کے دُنیا کو بدلنے کے لئے سیاسی قوت بھی بڑی ضروری چیز ہے۔ مانا کہ وہاں ایک جماعت ماہرین کی ایسی بھی ہے جو سرمایہ داری کو پسند نہیں کرتی لیکن وہ کر بھی کیا سکتے ہیں ان کے پاس کوئی سیاسی قوت ایسی نہیں جو وہ اپنے اصول کو سب سے تسلیم کرا سکیں، اس لئے جب تک وہ کسی بڑی جماعت کا ساتھ نہ دیں از خود کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتے اور یہ بڑی جماعت عمال ہی کی ہو سکتی ہے۔

دنیا میں ذہنی انقلاب پیدا کرنا آسان نہیں، بڑی دردسری کا کام ہے، اور اس کو ملک کی بڑی جماعت ہی انجام دے سکتی ہے۔ دور و دراز سفر کرنے کے لئے بڑے جہازوں ہی کی ضرورت ہوتی ہے"۔

ویلز: ۔ "لیکن ایسے سفر کے لئے کپتان کی بھی تو ضرورت ہوتی ہے"۔

اسٹالین : "بیشک ہوتی ہے، لیکن پہلے بڑا جہاز تو فراہم ہو"۔

ویلز :۔ "یہ بڑا جہاز کوئی مخصوص جماعت نہیں بلکہ جماعت انسانی ہے"۔

اسٹالین :۔ "مسٹر ویلز، آپ کے دلایل کی بنیاد اس حسن ظن پر قایم ہے کہ تمام آدمی اچھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ بُرے آدمی زیادہ ہیں اور بورژوا طبقہ میں کسی اچھائی کے پائے جانے کا میں قایل نہیں"۔

ویلز :۔ اس میں شک نہیں اب سے دس بیس سال قبل ٹکنکل قابلیت رکھنے والی صاحب رائے جماعت کم تھی اور اس کا رجحان بھی کسی انقلاب کی طرف نہ تھا، لیکن اب یہ جماعت بہت وسیع ہوگئی ہے اور ذہنی حیثیت سے بھی وہ بہت آگے ہے۔ ایک ماہرِ فن جو پہلے انقلاب کا لفظ بھی نہ سن سکتا تھا اب وہ اس سے کافی دلچسپی لینے لگا ہے۔ حال ہی میں مجھے رایل سوسائٹی کے ایک جلسہ میں جو انگریزوں کی ایک بڑی سائنٹفک سوسائٹی ہے شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس کے پریسیڈنٹ نے جو تقریر کی وہ زیادہ تر سوسائٹی کی جدید تنظیم سے تعلق رکھتی تھی، حالانکہ اب سے تیس سال قبل یہ بات ان کے ذہن میں بھی نہ آسکتی تھی"۔

اسٹالین :۔ "ہاں، میں اس سے واقف ہوں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں کی سرمایہ دار سوسائٹی اب ضغطہ میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ اس سے نکلنا چاہتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی نفع اندوزی کو بھی ساتھ لیجانا چاہتی ہے۔ پھر یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ گھٹنوں کے بل سر جھکا کر خطرہ کے اس دروازہ سے باہر ہوجائیں لیکن سر اُٹھا کر وہ نہیں گزر سکتے"۔

ویلز :۔ آپ کو تو انقلاب کا عملی تجربہ حاصل ہے۔ اس لئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ عوام خود کبھی نہیں اُبھرتے اور انقلاب ہمیشہ اقلیت والی جماعتوں ہی نے پیدا کیا ہے"۔

اسٹالین :۔ بےشک انقلاب لانے کے لئے انقلاب انگیز غیر مطمئن اقلیت ہی کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اقلیت خواہ کتنی ہی ذہین، پُرخلوص و باعمل ہو، وہ کچھ نہیں کرسکتی اگر عوام کی ہمدردی اسے حاصل نہ ہو"۔

ویلز :۔ "میں نے مغرب میں کمیونسٹ پروپاگنڈا کا مطالعہ کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں یہ پروپاگنڈا بڑی دقیانوسی چیز معلوم ہوتا ہے۔ کسی سوشل نظام کے خلاف انقلابی پروپاگنڈا اسی وقت مناسب ہے جب سوسائٹی کو حکمراں جماعت کی طرف سے جبر و زیادتی کی شکایت ہو۔ لیکن موجودہ حالات میں جبکہ پُرانا سوشلزم خود منہدم ہورہا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ کارکردگی کی مہارت و اہلیت پر زیادہ زور دیا جائے اور اسی لئے کمیونسٹ پروپاگنڈا تعمیری خیال رکھنے والوں کو پسند نہیں آتا"۔

اسٹالین :۔ "یہ صحیح ہے کہ مغرب میں پرانا نظام منہدم ہورہا ہے لیکن اسی کے یہ بھی غلط نہیں کہ اس نظام کے باقی رکھنے کی بھی کوششیں ہورہی ہیں۔ اگر پُرانا نظام درہم برہم ہورہا ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ از خود طبعی طور پر ایسا ہورہا ہے۔ کسی قدیم سوشل نظام کی جگہ جدید نظام کا قایم ہونا بڑا پیچیدہ معاملہ ہے اور اس کے لئے جماعتوں کا باہمی تصادم ضروری ہے۔

اگر سرمایہ داری ختم ہورہی ہے تو یہ ختم ہونا اس طرح کا نہیں ہے جیسے کوئی درخت پُرانا اور کھوکھلا ہوکر از خود زمین پر آرہے، بلکہ اس کے لئے دو متصادم جماعتوں میں موت و حیات کی سی کشش پیدا ہونا ضروری ہے، جب کہیں جاکر نیا نظام قایم ہوگا اور اسکے بعد بھی اس نئے نظام کی حفاظت کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ مثلاً فاسزم کو لیجئے کہ وہ اب بھی اپنی رجعت پسندانہ ذہنیت کو قایم رکھنا چاہتی ہے اور پُرانے نظام کو جبر و قوت کے ساتھ برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کسی فاسسٹ کو دلایل سے قایل کرسکتے ہیں اور وہ محض افہام و تفہیم سے اپنے مقصود کو ترک کردیگا؟ ہرگز نہیں۔ پھر آپ کیا کریں گے؟ لامحالہ سختی سے کام لینا پڑے گا۔

کمیونسٹ جماعت کبھی جارحانہ اقدام کو پسند نہیں کرتی، لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ پُرانا نظام از خود ختم ہونے والا نہیں ہے اور اس کے حمایتی پوری قوت کے ساتھ اس کا ساتھ دے رہے ہیں، اس لئے کمیونزم بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں

بیٹھ سکتی اور وہ پرولتاری طبقہ کو ہدایت کرتی ہے کہ اپنے پاؤں میں بیڑیاں نہ پڑنے دے اور سختی کا جواب سختی سے دے"۔

ویلز:۔ "یہ صحیح ہے لیکن کیا کمیونسٹ جماعت کا جارحانہ اقدام بالکل اسی قسم کا رجعت پسندانہ اقدام نہیں ہے جس کا الزام آپ سرمایہ دار حکومتوں پر رکھتے ہیں"۔

اسٹالین:۔ کمیونسٹ جماعت کا اقدام ایک ٹھوس تاریخی بنیاد رکھتا ہے اور کمیونزم اچھی طرح واقف ہے کہ سرمایہ دار جماعت باوصف اس کے کہ وہ ختم ہو رہی ہے یوں آسانی سے نئے نظام کے لئے جگہ نہیں چھوڑ سکتی۔ انگلستان کی سترھویں صدی کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے۔ اس وقت بھی سب یہی کہتے تھے کہ پرانا نظام فرسودہ ہے، لیکن جب تک کرامول نے اٹھ کر سختی سے اسے ختم نہیں کیا وہ چلتا ہی رہا"۔

ویلز:۔ "کرامول نے جو کچھ کیا کانسٹی ٹیوشن (دستور) کے تحت کیا اور دستور ہی کی طرف سے کیا"

اسٹالین:۔ "(طنزیہ لہجہ میں) ہاں، پارلیمنٹ کو توڑنا، بادشاہ کو قتل کرنا، امراء کو گرفتار کر کے ہلاک کر دینا، یہ سب دستور ہی کے تحت تھا!

خیر اس کو جانے دیجئے ہمارے ملک کو دیکھئے، کیا دنیا کو معلوم نہ تھا کہ زار کی حکومت بالکل کھوکھلی ہے، لیکن اسی فرسودہ اور سڑی ہوئی حکومت کو ختم کرنے کے لئے کتنا خون بہانا پڑا۔

اکتوبر کے انقلاب کو دیکھئے۔ کیا دنیا اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ روس کا سرمایہ دارانہ نظام حد درجہ بوسیدہ ہو چکا ہے لیکن اسے دور کرنے کے لئے بالشویک جماعت کو اندرونی و بیرونی مزاحمتوں کا کتنا سخت مقابلہ کرنا پڑا اور کتنی خونریزی ہوئی۔

اخیر اٹھارویں صدی کے فرانس کو لیجئے۔ ۱۷۸۹ء سے بہت پہلے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہاں کا جاگیردارانہ اور شخصی حکومت کے نظام کی عمارت متزلزل ہو چکی ہے، لیکن عوام و امراء کی جماعتوں میں باہمد گر تصادم و خونریزی کے بغیر وہ نظام دور نہ ہو سکا۔

بات یہ ہے کہ پرانے نظام کے طرفدار یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی عمارت میں صرف چند شگاف پڑ گئے ہیں جن کو بھرا جا سکتا ہے اور مرمت کے بعد اس تعمیر سے پھر کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے اپنے وجود اور اپنے ذرائع عیش و مسرت کو بچانے کے لئے وہ جان کی بازی لگا دیتے ہیں، پھر جب تک ان کے مقابلہ میں دوسری جماعت بھی جانبازی سے کام نہ لے، کار برآری دشوار ہے"۔

ویلز:۔ "لیکن انقلاب فرانس کی سرکردگی تو وہاں کی حامی قانون جماعت نے کی تھی"۔

اسٹالین:۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انقلاب فرانس کی کامیابی میں عوام کا ہاتھ نہ تھا اور انقلاب کے بعد جو حکومت قایم ہوئی تھی وہ بغیر عوام کی مدد سے قایم رہ سکتی تھی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہاں کی حامی قانون جماعت نے جو کچھ کیا وہ قانون رائج الوقت کے مطابق کیا، کیا انھوں نے اس کی جگہ نیا قانون بنا کر اس پر عمل نہیں کیا؟

تاریخ کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کر سکتی کہ کسی جماعت نے خوشی سے اپنا اقتدار دوسری جماعت کو سونپ دیا ہو اور اسی لئے کمیونسٹ جماعت کو ہر وقت ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار رہنا پڑتا ہے"۔

ویلز:۔ "میں تسلیم کرتا ہوں کہ قوت کا استعمال کبھی کبھی ضروری ہو جاتا ہے لیکن میری رائے میں قوت کا استعمال اسی حد تک ہونا چاہئے جس حد تک قانون اجازت دے۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قانون کا احترام ضروری ہے یعنی قانون کے حدود کے اندر رہتے ہوئے سب کچھ کرنا چاہئے اور جماعتی پروپاگنڈا میں صرف تعلیم یافتہ لوگوں حصہ لینا چاہئے۔ عوام کے ہاتھ میں دیکر اسے کھلونا نہ بنانا چاہئے"

اسٹالین:۔ "کسی اہم مقصد کے حاصل کرنے کے لئے صرف مضبوط انقلاب پسند جماعت ہی کافی نہیں، بلکہ ایک امدادی قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور یہ قوت سپاہ پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ ملک کے صاحب رائے افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ رہا تعلیم یافتہ طبقہ جس کا

ذکر آپ نے کیا ہے، سو میں نہیں کہہ سکتا کہ تعلیم یافتہ طبقہ سے آپ کی کیا مراد ہے، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ تعلیم یافتہ طبقہ ہی تھا جس نے سترھویں صدی میں انگلستان کے نظام کہنہ کا ساتھ دیا، اٹھارویں صدی میں امراء کی طرفداری کی اور انقلاب اکتوبر میں روس کی مستبد جماعت کی اعانت کی۔

تعلیم صرف ایک ہتھیار ہے اور دیکھنے کی چیز صرف یہ ہے کہ اسے کون کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پرولتاریت اور سوشلزم کو بھی نیا نظام استوار کرنے کے لئے تعلیم یافتہ طبقہ کی ضرورت ہے، لیکن اس تعلیم یافتہ طبقہ سے کیا مراد ہے اس کی تعیین آسان نہیں۔ ان تعلیم یافتہ لوگوں کی قسمیں بہت ہیں اور ہمیں صرف ایک ہی قسم سے کام لینا ہے۔

ویلز:۔ "دنیا میں کوئی انقلاب ممکن نہیں، جب تک پہلے نظام تعلیم میں انقلاب نہ پیدا کیا جائے۔ مثلاً جرمن ریپبلک کو لیجئے کہ اس نے قدیم نظام تعلیم کو بدستور قایم رہنے دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ریپبلک نہ بن سکی۔ دوسری مثال برطانیہ کی لیبر پارٹی کی ہے کہ اس نے بھی نظام تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور نتیجہ وہی ناکامی ہوا۔"

اسٹالین:۔ "آپ نے بالکل صحیح کہا۔ اب آپ اپنی تینوں باتوں کا جواب مختصراً سن لیجئے۔ اول یہ کہ انقلاب کے لئے ضروری و بنیادی چیز "طبقۂ عمال" کا وجود ہے، دوسرے یہ کہ انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہے جسے کمیونسٹ اصطلاح میں پارٹی کہتے ہیں، یہ پارٹی مشتمل ہوتی ہے ذہین کام کرنے والوں اور اچھے ماہرین فن پر جو طبقۂ عمال سے قریب تر ہوتے ہیں، تیسرے یہ کہ انقلاب کے لئے سیاسی قوت بھی ضروری ہے تاکہ نئی حکومت، نئے قوانین نافذ کر سکے۔ نظام حکومت میں نئے پرانے کی تقسیم میں نہیں کرتا، میں تو صرف اس نظام کا قایل ہوں جو طبقۂ عمال کے مفاد کا محافظ ہو۔ اگر پرانے قانون میں کوئی بات ایسی ہے جس سے ہم مقصود حاصل کر سکتے ہیں تو اس کو قایم رہنا چاہئے۔

میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ نئے نظام کے قایم کرنے میں خواہ مخواہ بدامنی یا لڑائی جھگڑا پیدا کیا جائے اور میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کوئی نہیں ہو سکتی اگر موجودہ حکمراں جماعتیں، طبقۂ عمال کے مطالبات کو اصولاً تسلیم کر کے ان کو پورا کریں۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا کبھی ہوا نہیں اور نہ آیندہ ہونا ہے۔

ویلز:۔ "مگر انگلستان کی تاریخ میں ہم کو ایسی ایک مثال ملتی ہے کہ ایک جماعت نے اپنا اقتدار خوشی سے دوسری جماعت کو سونپ دیا۔ ۱۸۳۰ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیانی زمانہ میں وہاں کے طبقۂ امراء نے جن کا اثر اٹھارویں صدی میں بھی کافی پایا جاتا تھا، اپنا اقتدار خوشی سے بورژوا (اوسط) طبقہ کے سپرد کر دیا۔"

اسٹالین:۔ "آپ انقلاب کے مسئلہ سے ہٹ کر اب اصلاح (ریفارم) کے مسئلہ پر آگئے اور یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ تاہم میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انگلستان کی چارٹسٹ[1] تحریک نے انگلستان کی اصلاح میں جو حصہ لیا وہ اہم نہ تھا؟

ویلز:۔ "چارٹسٹ جماعت نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا اور اخیر میں وہ ختم بھی ہوگئی۔"

اسٹالین:۔ "میں اس مسئلہ میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ ان کی اسٹرائک کی تحریک نے کافی کام کیا اور حکمراں جماعت انکی مجوزہ

---

[1] ۱۸۳۸ء میں مصلحین کی ایک جماعت لندن میں رونما ہوئی اور اس نے ایک چارٹر (منشور) کے ذریعہ سے چھ اصلاحات کا مطالبہ حکومت سے کیا۔ اس جماعت کو چارٹسٹ (منشوریئین) کہتے ہیں۔ ۱۸۴۰ء میں انھوں نے دس لاکھ آدمیوں سے دستخط کرا کے ایک محضر دار العوام میں پیش کیا۔ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۲ء کے درمیان اس سلسلہ میں کچھ ہنگامے بھی ہوئے لیکن یہ تحریک بعد کو کچھ دب گئی۔ پانچ چھ سال کے بعد ۱۸۴۸ء میں پھر اس میں دوبارہ زندگی پیدا ہوئی اور آخر کار ان کے چھ اصلاحی مطالبات میں سے چار تسلیم کئے گئے اور ۲۰ سال تک ان پر عمل بھی ہوتا رہا۔ (نیاز)

اصلاحات میں سے بعض کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مغرب کی تمام حکمراں جماعتوں میں انگلستان ہی ایک ایسی حکومت ہے جو زیادہ ہوشیار ہے اور جو جماعتی مفاد کے مسئلہ میں کافی لچک اپنے اندر رکھتی ہے۔ مثلاً ۱۹۲۶ء کے اسٹرائک کو لیجئے کہ اگر یہ اسٹرائک کسی دوسرے ملک میں ہوتی تو ٹریڈ یونین کے ممبر گرفتار کر لئے جاتے، لیکن برطانیہ کے بورژوا طبقہ نے ایسا نہیں کیا بلکہ خود اپنے مفاد کے پیشِ نظر انھوں نے اس شورش کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ امریکہ، فرانس اور جرمنی میں اگر یہی صورت پیدا ہوتی تو معاملہ یوں آسانی سے طے نہ پاتا۔ برطانیہ نے اپنا اقتدار قایم رکھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی اصلاحات کے نفاذ میں اکثر و بیشتر رواداری سے کام لیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ جو اصلاحات برطانیہ نے تسلیم کیں وہ ایسی انقلاب انگیز نہ تھیں کہ اس کی حکمراں جماعت کو کوئی نقصان پہونچتا۔"

ویلز:- "آپ نے میرے ملک کی حکمراں جماعت کے متعلق جو رائے قایم کی ہے وہ میری رائے سے زیادہ بلند ہے۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ایک معمولی انقلاب اور بڑی اصلاح میں بہت بڑا فرق ہے ؟"

اسٹالین:- "عوام کے دباؤ سے کبھی کبھی بورژوا طبقہ ایسی اصلاحات تسلیم کر لیتا ہے جو اس کے اقتصادی و معاشرتی نظام کو صدمہ نہ پہونچائیں اور وہ یہ صرف اس لئے کرتا ہے کہ اس کا جماعتی اقتدار باقی رہے اور یہ ہے ان اصلاحات کی روح جن کا ذکر آپ نے کیا۔ انقلاب نام ہے اس کا کہ حکومتی اقتدار ایک جماعت سے دوسری جماعت میں منتقل ہو جائے۔ اس لئے ہم کسی اصلاح یا ریفارم کو انقلابی نہیں کہہ سکتے۔"

ویلز:- "میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے سوشلزم کے اصول کی تشریح میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا اور مجھے ان کے سمجھنے کا موقع دیا۔ اس وقت روئے زمین پر صرف دو ہستیاں ہیں جن کے ایک ایک لفظ پر دنیا کے کان لگے ہوئے ہیں۔ آپ اور روز ویلٹ۔ باقی اور لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ چنداں قابلِ لحاظ نہیں۔ میں یہاں کل ہی آیا ہوں لیکن انھیں چند گھنٹوں میں میں نے یہاں کے مردوں عورتوں کے بشاش چہرے اور صحیح و توانا جسم دیکھ کر اندازہ کر لیا ہے کہ یہاں بہت کچھ ہو رہا ہے اور ۱۹۲۶ء کے مقابلہ میں روس کی موجودہ حالت بدرجہا بہتر ہے۔"

اسٹالین:- "ہاں، اس سے بہت زیادہ کام ہو جاتا اگر ہم "بالشیوک" زیادہ ہوشیار ہوتے۔"

ویلز:- "ہم بالشیوک" نہیں بلکہ یوں کہئے کہ "اگر جماعتِ انسانی زیادہ ہوشیار ہوتی"۔ کیا اچھا ہوتا اگر آپ کوئی "پنج سالہ منصوبہ" انسان کی دماغی تربیت کے لئے بھی سوچ سکتے۔"

اسٹالین:- "کیا آپ "سوویٹ رائٹرس اسوسی ایشن" کی کانگرس میں شرکت کے لئے زیادہ نہ ٹھہر سکیں گے ؟"

ویلز:- "افسوس ہے کہ میں یہاں ایک ہفتہ سے زیادہ قیام نہیں کر سکتا۔ مجھے اور بہت سے کام ہیں، میں تو یہاں صرف آپ سے ملنے آیا تھا اور میں اس ملاقات کا بڑا اطمینان بخش اثر لیکر جا رہا ہوں۔"

ترغیباتِ جنسی
یا
شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی۔ نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار

ایک سچا دوست

"آنسہ عایشہ" معاشیات کی ام - اے ہیں اور اس وقت تک اپنی چھوٹی سی عمر کا بڑا حصہ انھوں نے کچھ ایسے ہی خشک مطالعہ میں صرف کیا ہے جو عورت کی توہین تو نہیں، لیکن شاید اسکے لئے چنداں قابل فخر بھی نہیں ہے!

ایک دن خلاف معمول میں نے ان کے ہاتھ میں آسکر وائلڈ کا مجموعۂ مضامین دیکھ کر حیرت سے انکی طرف دیکھا تو بولیں :- "نیاز صاحب، زندگی میں کبھی کبھی آسمان سے اتر کر زمین پر بھی آنے کو بھی جی چاہتا ہے، آخر کوئی کب تک عقل و ہوش کی باتیں کرے"

مجھے ان کا یہ جواب سنکر ایک لطیفہ یاد آگیا :-

"دو بے تکلف دوست بیٹھے ہوئے آپس میں نہایت بے معنی لیکن حد درجہ دلچسپ گفتگو میں مصروف تھے کہ انھیں ایک اور تیسرے دوست سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے - یہ نہایت خشک قسم کے فلسفی تھے (ہو سکتا ہے کہ معاشیات ہی کے ماہر ہوں) - بہرحال یہ دونوں ان کو دیکھ کر بہت جز بز ہوئے اور آخر کار ان میں سے ایک نے دوسرے سے گھبرا کر کہا کہ Let us talk sense, there comes a fool (وہ دیکھو ایک بیوقوف آرہا ہے، آؤ اب کچھ سمجھ کی باتیں کریں)

میں نے "عایشہ" کا فقرہ سنکر کہا کہ "آپ یہ کتاب صرف اس شرط سے دیکھ سکتی ہیں کہ اسکی کوئی کہانی جو آپ کو پسند آئے اس کا ترجمہ کرکے مجھے دیجئے۔ چنانچہ انھوں نے "The Devoted friend" کا ترجمہ کرکے میرے پاس بھیجدیا۔

میں نے اس کو دیکھا تو دل ہی دل میں بہت ہنسا کیونکہ "عقل و ہوش" کی دنیا سے بیزار ہوجانے کے باوجود انھوں نے ترجمہ کے لئے جو کہانی پسند کی وہ بھی "آٹے دال" کی ذکر سے خالی نہ تھی - آخر معاشیات کی ماہر ٹھہریں نا!--

میں نے ان سے کہا کہ "یہ کہانی تو خیر میں شایع کئے دیتا ہوں، لیکن اب اس قسم کی باتیں آپ سے سننا مجھے منظور نہیں" چنانچہ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ دوسرے مضمون میں وہ "ڈالر و اسٹرلنگ" کے باہمی تعلق پر اقتصادی و معاشی حیثیت سے بحث کریں گی - ہمیں امید ہے کہ ان کا یہ موعودہ قیمتی مقالہ آیندہ اشاعت میں قارئین نگار کی نگاہ سے گزرے گا۔

(نیاز)

صبح خوشگوار تھی، بڑھے چوہے نے جھانکنے کے انداز میں بل سے سر نکالا۔ شیشے کی طرح چمکدار آنکھیں، شیر کی سی مونچھیں اور ربڑ کی سی دم — تالاب میں بطوں کے بچے چھپ چھپ کر رہے تھے، جن کو ان کی ماں تیرنے کے طریقے سکھا رہی تھی - ان کے ننھے جسم ماں کی طرح سفید نہ تھے، پیلاپن لئے ہوئے تھے۔

خفا ہونے کے انداز میں بطخ بولی - "تم کسی اچھی محفل میں نہیں جاسکتے، جب تک سر کے بل کھڑا ہونا نہ سیکھ لو" ساتھ ہی ماں نے سر کے بل کھڑے ہونا ان کو دکھایا، مگر بچوں پر کیا اثر؟ معصوم ہی ٹھہرے نا! انھیں محفلوں سے کیا واسطہ! یہ دیکھ کر بڈھا چوہا چیخا "توباہ، کیسے نالایق بچے ہیں ان کو تو ڈبو دینا چاہئے"۔

"خدا نہ کرے" بطخ بول اٹھی - "یہ تو کوئی نئی بات نہیں، ہر کام کے سیکھنے میں پہلے پہل دقت ہوتی ہے، ہاں یہ ضرور ہے "کہ ماں باپ کب تک صبر کریں"

چوہا بولا:- "اونہہ، مجھے ماں باپ سے کیا سروکار - کوئی گھربار والا تو ہوں نہیں - میری تو شادی بھی نہیں ہوئی اور نہ اب اس کی ضرورت ہے کہیں محبت وحبت ہوجائے تو یہ الگ بات ہے - اصل چیز تو دوستی ہے، دوستی جس کے بغیر دنیا بیکار ہے - سچی دوستی اور ایک سچا دوست"۔

— "یہ تو بتائیے آپ کا مطلب کیا ہے اور ایسے دوست کو کرنا کیا چاہئے" پاس ہی جھاڑی پر بیٹھی ہوئی چڑیا نے جو ساری باتیں سن رہی تھی پوچھا۔

— "ہاں، ہاں یہی تو میں بھی جاننا چاہتی" اور یہ کہکر بطخ دوسرے کنارے تیر گئی اور سر کے بل غوطہ لگاتے ہوئے بچوں کو نصیحت آمیز انداز میں دیکھا۔

— "کس قدر مہمل سوال ہے" چوہا زور سے چیخا "دوست سے وفاداری کے سوا اور کیا امید ہوسکتی ہے۔ ہونہہ!"

چھوٹی چڑیا نے پھولوں سے لدی ہوئی دوسری ڈالی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا:- "اس کے بعد ہم کو کیا کرنا چاہئے"

چوہا:- "چل تیری بات میری سمجھ میں نہیں آتی"

چڑیا:- "اچھا میں تم کو ایک کہانی سناتی ہوں"

چوہا:- "ہاں، ہاں ضرور سناؤ، مجھے قصے کہانیوں میں بڑا مزا آتا ہے، مگر یہ میرے متعلق تو نہیں ہے؟"

چڑیا:- "ہاں یہ تم پر بھی چپک سکتی ہے" اور یہ کہکر اپنی کہانی شروع کرنے قریب آبیٹھی۔

چڑیا:- "بہت دن ہوئے ایک بڑا نیک آدمی رہا کرتا تھا، اس کا نام ہنیس تھا۔

چوہا:- "کیا وہ بہت مشہور آدمی تھا؟"

چڑیا:- "مشہور تو نہ تھا، مگر تھا بہت نیک — وہ اپنی چھوٹی کٹیا میں اکیلا رہتا اور دن بھر باغ میں کام کیا کرتا۔ اسکی کٹیا اپنے خوبصورت پھولوں کی وجہ سے بہت مشہور تھی رنگ برنگ کے خوشنما پھولوں کی مہک ہر طرف پھیلی رہتی تھی۔ ہنیس کے دوست بہت تھے۔ مگر سب سے زیادہ عزیز دوست میلر تھا۔ جو کبھی کٹیا کے پاس سے بغیر پھول توڑے نہ گزرتا اور پھلوں کے زمانہ میں ان سے اپنی جیبیں بھرلیتا۔

میلر کہا کرتا کہ دوستوں کی ہر چیز ایک دوسرے کے لئے ہونا چاہئے، ہنیس یہ سن کر مسکراتے ہوئے سر ہلا دیتا۔ ہنیس کو اپنے دوست کے خیالات پر بڑا فخر تھا۔ اکثر پڑوسیوں کو اس پر بہت تعجب ہوتا کہ میلر کبھی کوئی چیز ہنیس کو نہیں دیتا تھا۔ حالانکہ اس کی چکی پر خدا جانے کتنے بورے آٹے کے پڑے رہتے تھے۔ دودھ دیتی ہوئی کئی گائیں بھی اسکے پاس تھیں اور بھیڑوں کے کئی ریوڑ۔

ہنیس غریب کبھی ان باتوں پر غور نہ کرتا، وہ تو ہر وقت بے غرض دوستی کی باتیں کیا کرتا اور انھیں میں مست رہتا۔

— ہاں تو ہنیس سال بھر بعد اپنے باغ میں سوت کاتا کرتا، اور خوش رہتا۔ مگر جاڑا شروع ہوتے ہی اس کے پھل پھول ختم ہوجاتے تو اس کے کھانے کا سہارا بھی ختم ہوجاتا اور جاڑے کی تکلیف بھی برداشت کرنا پڑتی۔

اکثر وہ بغیر کھائے پئے سو جاتا ۔ کبھی کبھی سوکھے ہوئے پھلوں پر بسر کرتا ۔
مگر خاص تکلیف جو اس کو بہت ستاتی یہ تھی کہ اس زمانہ میں میلر اس کو دیکھنے کبھی نہ آتا ۔

—— "آج کل ہنیس کے پاس جانے سے کیا فائدہ' ہر طرف برف ہی برف ہے ۔ اور یوں بھی پریشانی میں لوگوں سے ملنے جلنے میں کیا لطف آسکتا ہے"۔ میلر اپنی بیوی سے کہتا ۔" میرا تو خیال دوستی کے بارے میں یہ ہے اور ٹھیک بھی ہے ۔ مگر بہار شروع ہوتے ہی میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا ۔ اور اپنی ڈلیا بھر کر پھول بھی لاؤں گا ، میں جانتا ہوں ہنیس کو اس سے بڑی خوشی ہوتی ہے"۔

دہکتی ہوئی آگ کے نزدیک بیٹھی ہوئی بیوی بولی ۔" کس قدر خیال کرتے ہو تم دوسروں کا ۔ دوستی کے بارے میں تمہاری باتیں مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں ، میں تو کہتی ہوں بڑے آدمی بھی جو اونچے اونچے مکانوں میں رہتے ہیں اور سونے کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں ، ایسی باتیں نہیں کرسکتے "۔

—— مگر ہم ہنیس کو یہاں کیوں نہ بلالیں ؟ ' میلر کے چھوٹے بچّے نے کہا " ہنیس اگر پریشان ہے تو میں اس کو اپنی آدھی کھیر کھلاؤں گا اور خرگوش بھی دکھاؤں گا "۔

میلر چلایا " کس قدر بیوقوف لڑکا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے اسکول بھیجنے سے کیا فائدہ ۔ ابھی تک تو کچھ نہیں سیکھا ۔ اگر ہنیس یہاں آگیا تو وہ ہماری دہکتی ہوئی آگ ، اچھے کھانے اور عمدہ شراب دیکھ کر یقیناً ہم سے جلنے لگے گا اور اچھی طبیعت والوں کے لئے یہ بات بہت بُری ہے ۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ میرا سب سے اچھا دوست ایسا کرے ۔ میں اس کو ہمیشہ اس طرح کی برائیوں سے بچاؤں گا اور مان لو وہ یہاں آیا تو ضرور کچھ آٹا قرض مانگے گا جو میں نہیں دینا چاہتا ۔ آٹا اور چیز ہے ، دوستی اور شے ۔ ان دونوں کو ملانے سے فائدہ ؟ غور تو کرو کس قدر فرق ہے دونوں میں "۔

بیوی :۔" تم کیسی اچھی باتیں کرتے ہو ۔ مجھے تو نیند آنے لگتی ہے "۔

میلر :۔" اچھے کام تو بہت لوگ کرتے ہیں مگر اچھی باتیں کرنا کم لوگ جانتے ہیں —— باتیں کرنا کام کرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے "۔ ساتھ ہی اس نے چھوٹے لڑکے کی طرف دیکھا جو شرم سے سر جھکائے رو رہا تھا اور جس کے موٹے موٹے آنسو چائے کی پیالی میں گر رہے تھے ، کیا کہانی ختم ہوگئی ، چوہے نے پوچھا)۔

چڑیا :۔" نہیں ابھی تو شروع ہوئی ہے "

چوہا :۔" تب تو تم نے اپنی کہانی بڑے پُرانے ڈھنگ سے شروع کی ، آج کل تو لوگ کہانی اخیر سے شروع کرتے ہیں پھر ابتدا کی بات بتا کر بیچ میں ختم کر دیتے ہیں ۔ یہ ہے نیا طریقہ کہانی سنانے کا ۔ ایک دن میں نے ایک تنقید نگار کو ایک نوجوان سے یہی کہتے سنا تھا ۔ تنقید نگار جس کا چشمہ ہمیشہ ناک پر رہتا اور سر گنجا تھا ، نوجوان کی ہر بات کو ہنسی میں اُڑا دیتا اور ہشت کہکر ٹال دیتا ۔ خیر تم اپنی کہانی کہو مجھے میلر بہت پسند آیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے اس کے درمیان بڑی پُرانی دوستی ہے "۔

چڑیا بولی :۔" جیسے ہی سردی کا موسم ختم ہوا اور پھول کھلنے لگے ، میلر نے اپنی بیوی سے کہا اب میں ہنیس سے ملنے ضرور جاؤں گا "

بیوی :۔" تم کتنے نیک دل ہو ، اور کتنا خیال دوسروں کا کرتے ہو ، لیکن دیکھو پھولوں کے لئے بڑی ڈلیا لیجانا "

میلر ، ہنیس سے ملنے کے لئے چل پڑا ۔

ہنیس ، اپنا کھرپا لئے باغ میں کام کر رہا تھا ۔ میلر کو دیکھتے ہی خوشی سے باغ باغ ہوگیا ۔

میلر:- "کہو، سردیاں کیسی کٹیں"۔
ہنیس خوش ہو کر بولا "تم کتنے اچھے آدمی ہو - میرا کس قدر خیال رکھتے ہو - ہاں مجھے سردیوں میں بڑا بُرا وقت دیکھنا پڑا!! لیکن اب بہار کا موسم آگیا ہے، میں بہت خوش ہوں - میرے خوبصورت پھول کھل رہے ہیں"۔
میلر:- "ہم اکثر تمھاری باتیں کیا کرتے تھے"
ہنیس:- "تم کس قدر مہربان ہو' میں ڈرتا تھا کہیں تم بھول نہ گئے ہو"
میلر:- "ہنیس تم کیسی باتیں کرتے ہو، دوست بھی کبھی بھلائے جاتے ہیں' دوستی ہی تو اصل چیز ہے - معلوم ہوتا ہے تم نے آج تک زندگی کو سمجھا ہی نہیں' ارے، تمھارے پھول کس قدر خوبصورت ہیں"؛
ہنیس:- "پھول تو میری خوش قسمتی ہیں - آج میں ان کو بازار لیجاکر بیچوں گا اور اپنا ٹھیلہ واپس لے آؤں گا"۔
میلر:- "کیا تم نے وہ بیچ دیا تھا - بڑی بیوقوفی کی"
ہنیس:- "ہاں مجھے ایسا کرنا پڑا - جاڑے میں جب میرے پاس کچھ کھانے کو نہ رہ گیا تو مجھے چاندی کی زنجیر، بٹن اور اپنا ٹھیلہ بیچنا پڑا - اب میں ان چیزوں کو واپس لے آؤں گا"۔
میلر:- "ہنیس میں تم کو اپنا ٹھیلہ دیدوں گا، حالانکہ وہ بہت اچھی حالت میں نہیں ہے، اس کا ایک پہیہ اور ایک طرف کا حصہ ٹوٹا ہوا ہے - گو ایسا کرنے پر لوگ مجھ کو بیوقوف بنائیں گے - مگر مجھے پروا نہیں، میں خود بھی ایک نیا ٹھیلہ خریدنے والا ہوں، اس لئے تم کو پریشان نہ ہونا چاہئے' میں اپنا ٹھیلہ تم کو دیدوں گا"۔
ہنیس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا "میلر تم مجھ پر بہت مہربان ہو، میں ٹھیلے کو بہت آسانی سے ٹھیک کرلوں گا - ایک لکڑی کا بڑا تختہ میرے پاس موجود ہے"۔
میلر:- "ارے وہ تختہ تو مجھے چاہئے - میری کھتوں کی چھت میں ایک بڑا سوراخ ہوگیا ہے اور اگر یہ ٹھیک نہ کیا گیا تو سارا غلہ سیل جائے گا - اچھا ہوا کہ تم نے اس کا ذکر کردیا دیکھو تو سہی کس طرح ایک نیکی سے دوسری نیکی پیدا ہوتی ہے - میں تم کو اپنا ٹھیلا دوں گا اور تم مجھے اپنا تختہ دو گے - حالانکہ وہ ٹھیلہ سے زیادہ قیمتی ہے - مگر خیر دوستی میں اس کا خیال"!
ہنیس "یقیناً یقیناً" کہتا ہوا گھر کی طرف دوڑا - اور ایک تختہ گھسیٹتا ہوا لے آیا -
میلر:- یہ تختہ زیادہ بڑا تو نہیں - شاید ہی اس میں کچھ بچ سکے جس سے تم ٹھیلہ ٹھیک کرسکو، مگر اس میں میرا کیا قصور ٹھیلہ میں نے تم کو دیدیا ہے اور مجھے امید ہے اس کے بدلہ میں آج تم مجھے کچھ پھول بھی ضرور دو گے - لو یہ رہی ڈلیا، ذرا خیال رکھنا پوری بھر جائے"۔
—— "ہاں ہاں پوری" ہنیس نے کہا - لیکن وہ اپنے رنج کو نہ چھپا سکا کیونکہ ڈلیا بہت بڑی تھی، جس کو بھر دینے کے بعد اس کے پاس بیچنے کے لئے پھول نہ رہ جاتے اور وہ پھول ہی بیچ کر ضرورت کی چیزیں لانے کے لئے بےچین تھا -
میلر:- "دیکھو میں تم کو اپنا ٹھیلہ دے چکا ہوں، اب کچھ پھول لے لینے پر تمھیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے - سچی دوستی بےغرض ہوتی ہے، اچھا خدا حافظ" میلر نے ڈلیا اٹھاتے ہوئے کہا -
ہنیس:- "خدا حافظ" اور پھر وہ خوش خوش زمین کھودنے میں لگ گیا، کیونکہ اس کو ٹھیلہ ملنے والا تھا -
ایک دن وہ دیوار پر بیلیں چڑھانے کے لئے کیلیں گاڑ رہا تھا کہ میلر کی آواز آئی - ہنیس جلدی سے سیڑھی پر سے کود کر باغ میں آگیا، میلر سڑک کے کنارے آٹے کا ایک بڑا تھیلہ سر پر رکھے کھڑا تھا -

میلر :۔ "میرے اچھے ہنیس کیا یہ آٹا تم بازار بیچ آؤ گے"۔
ہنیس :۔ "مجھے افسوس ہے، آج میں بہت مصروف ہوں، بیلیں دیوار پر چڑھانا ہیں۔ پھولوں میں پانی دینا ہے"۔
میلر :۔ "دیکھو میں تم کو اپنا ٹھیلہ دے رہا ہوں، میری بات نہ ٹالنا، ورنہ سچی دوستی پر الزام آجائے گا"
ہنیس :۔ "یہ نہ کہو میلر میں یہ نہیں سن سکتا، اور اپنی ٹوپی اوڑھتا باہر آگیا۔ تھیلہ لیکر بازار کی طرف چل پڑا۔ گرمی سخت تھی اور سڑک پر بہت خاک اڑ رہی تھی۔ چھ میل چلنے کے بعد وہ بہت تھک گیا تھا، مگر پھر بھی ہنیس چلتا رہا اور بازار پہونچکر آٹا اچھی قیمت پر بیچنے کے بعد گھر آگیا۔ پلنگ پر لیٹ کر اسے خیال آیا، کتنا سخت دن گزرا۔ مگر ساتھ ہی یہ خوشی بھی تھی کہ اس نے اپنے دوست کی بات کو نہ ٹالا۔ دوسری صبح میلر ہنیس کے اٹھنے سے پہلے آ پہونچا۔
میلر :۔ "تم کس قدر سست آدمی ہو، میں تم کو اپنا ٹھیلہ دے رہا ہوں۔ تم کو اب زیادہ کام کرنا چاہئے۔ بیکاری بڑا گناہ ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا دوست اس گناہ میں مبتلا ہو۔ تم میری صاف گوئی کا برا نہ ماننا، خوشامد تو سب کرتے ہیں مگر سچی دوستی میں صاف گوئی نہ چھوڑنا چاہئے، چاہے اس میں کتنی ہی تکلیف ہو"۔
ہینس آنکھیں ملتے ہوئے بولا "میں شرمندہ ہوں مگر تھک جانے کی وجہ سے میں نے سوچا کہ کام شروع کرنے سے پہلے ذرا چڑیوں کا چہچہانا سن لوں، اس طرح میں کام زیادہ کرسکوں گا"۔
میلر :۔ "خیر ٹھیک ہے، مگر آج آکر ذرا میری چھت شروع کردو"
غریب ہنیس اپنے باغ میں کام کرنے کے لئے بیچین تھا۔ اس کے پودوں میں پانی نہیں پہونچا تھا۔ لیکن وہ اپنے دوست سے کیا انکار کرتا۔ پھر بھی اس نے آہستہ سے کہا کہ مجھے تو آج باغ میں بہت کام کرنا ہے۔
میلر :۔ "دیکھو میں اپنا ٹھیلہ تم کو دے رہا ہوں، اس لئے یہ امید کرتا ہوں کہ تم میرا کام کردو گے، لیکن خیر اگر تم انکار کرتے ہو تو میں خود ٹھیک کرلوں گا"
ہینس "نہیں نہیں" کہتا ہوا بستر سے اٹھا اور کھلیان کی طرف چلدیا وہ دن بھر کام کرتا رہا۔ شام کے وقت میلر اس کو دیکھنے آیا اور خوش ہوکر بولا "کیا تم نے چھت ٹھیک کردی"
"ہاں قریب قریب" ہنیس سیڑھی سے نیچے اتر آیا۔
میلر :۔ "کس قدر خوشی ہوتی ہے دوسرے کا کام کرکے"
ہنیس نے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "میلر تم کتنی اچھی باتیں کرتے ہو"۔
میلر :۔ "تم کو بھی ایک دن یہ باتیں آجائیں گی، مگر تم کو اس سے زیادہ تکلیفیں اٹھانے کی عادت ڈالنا چاہئے۔ ابھی تو صرف دوستی کی ابتداء ہے ایک دن تم کو اس کے اصول بھی معلوم ہوجائیں گے"!
ہنیس :۔ "کیا یہ ممکن ہے"؟
میلر :۔ "اچھا اب تم جاؤ میری چھت کافی ٹھیک ہوگئی ہے، اب گھر جاکر آرام کرو، میں چاہتا ہوں کل تم میری بھیڑیں چرانے انھیں پہاڑ پر لے جاؤ"
ہنیس کچھ نہ کہہ سکا۔ دوسری صبح میلر اپنی بھیڑوں کو لیکر پہونچ گیا اور ہنیس کو پہاڑ کی طرف جانا پڑا، شام کو جب وہ گھر لوٹا تو اس قدر تھکا ہوا تھا کہ کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے سوگیا۔ کافی دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی تو اس نے سوچا کہ آج میں ضرور اپنے باغ میں کام کروں گا، لیکن جب وہ ارادہ کرتا تو کچھ ایسا ہوتا کہ اپنے پھولوں پر توجہ دینے کے بجائے اپنے دوست کے کسی نہ کسی کام کے لئے اسے جانا پڑجاتا۔ ہنیس کو یہ سوچ کر پریشانی ہوتی۔ مگر اس کی تسکین اس

خیال سے ہو جاتی کہ یہ سب کچھ اپنے دوست کے لئے کرتا ہے اور وہ اسے اپنا ٹھیلہ دینے والا ہے، الغرض ہنیس اسی طرح میلر کے کام کرتا اور میلر اس کو دوستی کے متعلق اپنے خیالات بتاتا رہتا۔ جن کو ہنیس بھی اپنی نوٹ بک میں لکھتا جاتا اور ہر رات سونے سے پہلے پڑھ لیتا۔

ایک شام جب ہنیس آگ کے قریب بیٹھا پڑھ رہا تھا، دروازہ پر کسی نے دستک دی، ہوا بہت تیز چل رہی تھی، ہنیس نے سوچا کہ شاید طوفان کی وجہ سے دروازہ ہلا ہوگا مگر دوسری اور تیسری دستک زیادہ تیز تھی۔ ہنیس یہ سوچتے ہوئے اٹھا کہ شاید کوئی مسافر راستہ بھول کر ادھر آگیا ہے۔ مگر دروازہ کھولنے پر اس نے میلر کو کھڑا پایا جس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لکڑی تھی۔ میلر بولا "میں بہت پریشان ہوں میرا لڑکا زینہ سے گر گیا ہے۔ ڈاکٹر بہت دور رہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ زیادہ اچھا ہو اگر تم چلے جاؤ۔ اور دیکھو میں تم کو اپنا ٹھیلہ دینے جا رہا ہوں اس میں کچھ ہرج نہیں اگر تم میرا کچھ کام کر دو۔

"ضرور، ضرور" ہنیس بولا "میں فوراً جاتا ہوں، تم مجھے اپنی لالٹین دیدو۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کسی گڑھے میں نہ گر جاؤں"

میلر :- "میری لالٹین بالکل نئی ہے اور میں یہ نہ دوں گا"

ہنیس :- "خیر میں یونہی چلا جاؤں گا"

باہر طوفان بہت تیز تھا۔ اندھیری رات میں ہنیس کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہوا بہت تیزی سے چل رہی تھی مگر پھر بھی ہنیس چلتا رہا اور تین گھنٹے کے بعد ڈاکٹر کے یہاں پہونچ گیا۔ آواز دینے پر ڈاکٹر نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا "کون ہے"

—— "میں ہوں ہنیس"

—— "کیا کام ہے، بولو"

—— "میلر کا لڑکا زینہ پر سے گر گیا ہے۔ چوٹ آگئی ہے اور میلر نے تم کو بلایا ہے"

—— "اچھا"

ڈاکٹر تیار ہو کر نیچے آیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلدیا۔ ہنیس پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ طوفان تیز ہوتا جا رہا تھا اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ گھوڑے کا ساتھ نہ دے سکا اور راستہ بھول کر دلدل میں پھنس گیا۔ جہاں سے وہ نکل نہ سکا۔ دوسری صبح ایک گڑھے میں اس کی لاش تیرتی ہوئی پائی گئی۔ لوگ اس کو اس کی کٹیا میں لے آئے۔ سب لوگ اس کے جنازے میں شامل تھے۔ مگر میلر خاص رنج کرنے والوں میں سے تھا۔

میلر بولا:- "میں اس کا سب سے اچھا دوست تھا۔ مناسب یہ ہے کہ میں جنازے کے آگے آگے چلوں"— جو اکثر اپنی آنکھیں پوچھتا چل رہا تھا۔

لوہار بولا:- "غریب ہنیس کی موت سے سب کو بہت رنج ہے"۔ (جبکہ وہ لوگ دفن کرنے کے بعد ایک جگہ بیٹھ کر شراب پی رہے تھے)

میلر :- "میں نے اس کو اپنا ٹھیلہ قریب قریب دے ہی دیا تھا۔ مگر اب میں کیا کروں، نہ اس کی مرمت ہوسکتی ہے نہ بیچا جا سکتا ہے۔ ہاں آیندہ خیال رکھوں گا کہ کبھی کسی کو کوئی چیز نہ دوں، اس میں نقصان ہوتا ہے"

چوہا :- "کیا یہ کہانی کا انجام ہے، مگر میکلر کا کیا ہوا"

چڑیا :- "مجھ کو معلوم نہیں - نہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے"

چوہا :- "اس سے ظاہر ہوتا ہے تمھارے دل میں انسانیت نہیں"۔

مگر چڑیا بولی :- "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے تمھاری سمجھ میں کہانی نہیں آئی"

چوہا :- "کیا ؟ تمھارے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ کوئی بڑی نصیحت آموز کہانی تھی ؟"

چڑیا :- "یقیناً"

چوہا غصہ ہوکر بولا :- "تب تو یہ تم کو پہلے بتا دینا چاہئے تھا - کیونکہ میں بھی تنقید نگار کی طرح "ہشت" کر دیتا۔ اور یہ تو میں اب بھی کر سکتا ہوں، اور "ہشت" کہکر وہ اپنے بل میں بھاگ گیا۔

—— "ہاں، چوہے کی بابت تمھارا کیا خیال ہے"۔ بطخ نے پوچھا (جو اب تیر کر قریب آگئی تھی)

چڑیا بولی :- "اس میں اچھائیاں بھی ہوں گی مگر مجھے تو اس کی محبت سے مطلب ہے اور مجھے رنج ہے کہ میں نے اسے خواہ مخواہ نصیحت آمیز کہانی سنا کر خفا کر دیا۔

بطخ بولی :- "ہاں، یہ بات تو ہمیشہ ہی خطرناک ہوتی ہے"۔

عائشہ (ام - اے)

ایک ہزار پونڈ فی منٹ

کیا آپ کوئی ایسی نوکری قبول کرلیں گے (خواہ کتنی ہی بڑی تنخواہ کیوں نہ ملے) اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ اس نوکری کو قبول کرنے والے کو آج تک اپنے گھر کے بستر پر مرنا نصیب نہیں ہوا - اگر آپ اس کے لئے طیار ہیں تو ٹکساس کی آئیل کمپنی کے پاس چلے جائیے۔

ٹکساس میں پٹرول کے چشمے بکثرت پائے جاتے ہیں اور اکثر مشتعل ہو جاتے ہیں جس سے لاکھوں ڈالر کا نقصان کمپنی کو پہونچ جاتا ہے اور انھیں مشتعل چشموں کی آگ فرو کرنے کے لئے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ آگ صرف نائٹرو گلیسرین کے بموں سے بجھ سکتی ہے اور یہ بم مشتعل چشموں کے بہت قریب پہونچکر پھینکے جاتے ہیں لیکن یہ بم خود بڑی خطرناک چیز ہیں —— اور ضرورت سے زیادہ گرمی یا ذرا سا جھٹکا پہونچنے پر از خود پھٹ جاتے ہیں - اس لئے ان بموں کا مشتعل چشموں تک لے جانا بھی حد درجہ خطرہ کی بات ہے - ہر چند یہ بم خاص قسم کے ٹرک میں نہایت احتیاط سے لے جائے جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود تجربہ بتاتا ہے کہ آج تک اس ٹرک کا کوئی ڈرائیور اپنی طبعی موت سے نہیں مرا کیونکہ جو آدمی ٹرک چلاتا ہے وہی بم بھی پھینکتا ہے۔

جس وقت چشموں میں آگ لگنے کی اطلاع آتی ہے تو ڈرائیور ان بموں کو لیکر جو ربڑ کے گدوں میں لپٹے ہوتے ہیں، موقع پر روانہ ہوتا ہے اور ایسے راستہ سے گزرتا ہے جہاں کوئی قصبہ دس ہزار یا اس سے زیادہ آبادی کا اسے نہ ملے - پولیس کو پہلے سے اس کی روانگی کی اطلاع دیدی جاتی ہے اور اس کے لئے راستہ صاف کر دیا جاتا ہے۔

جب وہ آگ کے قریب پہونچتا ہے تو ابرک کا لباس پہن لیتا ہے اور ایک خاص قسم کی ٹوپی جس میں صرف آنکھوں کے لئے دو سوراخ ہوتے ہیں اوڑھ لیتا ہے اسی کے ساتھ اور ایک زنجیر اپنی کمر میں باندھ لیتا ہے تاکہ اگر گرمی کی شدت اسے بدحواس کردے تو لوگ زنجیر کھینچ کر اسے گھسیٹ لائیں - اسکے بعد وہ آگ کے قریب پہونچکر بم پھینکتا - لیکن بسا اوقات یہی ہوتا ہے کہ بم پھینکنے سے پہلے ہی گرمی کی شدت کے پیش نظر لوگ زنجیر کھینچکر اسے واپس لانا چاہتے ہیں، لیکن خالی زنجیر ہی واپس آتی ہے اور بم پھینکنے والے کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔

زندگی کی ابتداء اور اس کا عروج

سمندر زندگی سے معمور ہے، خشکی میں ہر طرف زندگی نظر آتی ہے، ہوا زندگی سے بھری ہوئی ہے، جدھر دیکھو زندگی ہے اور حرکت پیدائش ہے، اور موت ــــ حیات کا یہ عجیب سلسلہ جو ہماری زمین پر قایم ہے اس کو دیکھ کر ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں، زندگی کیا ہے؟ اور موت سے کیا مطلب ہے؟ ایک زندہ ہستی (مثلاً انسان، جانور، یا پھول) میں اور ایک مردہ چیز (جیسے لکڑی، پتھر یا مٹّی) میں کیا فرق ہے؟ زندہ چیزوں کی کتنی قسمیں ہیں اور اُن میں اس قدر اختلاف کیوں ہے؟ وغیرہ بہت سے ایسے سوالات ہیں جو ہمارے سامنے آتے ہیں اور علم الحیات کا موضوع انھیں سوالات کا جواب دینا ہے

ہم جانتے ہیں کہ ہر زندہ چیز ایک روز فنا ہو جاتی ہے، لیکن زندگی کو موت نہیں، اس وقت زمین پر کوئی ایسی چیز موجود نہیں جواب سے دو ہزار سال پہلے سے زندہ چلی آرہی ہو (بجز دیودار کے درختوں کے جو لبنان کے پہاڑوں پر موجود ہیں) اس دو ہزار سال کی مدت میں نہ کوئی درخت باقی رہا، نہ کوئی جانور، لیکن پھر بھی زمین پر زندگی ہی زندگی ہے، بلکہ دو ہزار سال پہلے کی دنیا سے اب وہ زندگی سے زیادہ معمور ہے، یہ کیوں! اس لئے کہ والدین زندگی کی امانت اپنی اولاد کے سپرد کر کے رخصت ہو جاتے ہیں اور اس طرح اُن کی اولاد یہ امانت آیندہ نسل کو سپرد کر دیتی ہے، اور یہ سلسلہ حیوانات و نباتات میں برابر قایم ہے۔

یہ تمام زندہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ ان کی ابتداء کس طرح ہوئی اس کے جواب میں عوام کے لئے تو یہ کہدینا کافی ہے کہ سب کو خدا نے پیدا کیا، لیکن حقایق تلاش کرنے والے کے لئے یہ جواب کافی نہیں، لہٰذا آئیے اب ہم علم کی روشنی میں اس سوال کا جواب تلاش کریں، کہ اس کی ابتداء اور اس کی داستانِ عروج کیا ہے۔

زندہ چیزوں کی دو قسمیں ہیں حیوانات و نباتات، اور یہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، سب سے بڑا اختلاف یہ ہے کہ حیوانات چلتے پھرتے اور حرکت کرتے رہتے ہیں اور نباتات میں حرکت نہیں پائی جاتی، لیکن نباتات کے اس طرح متحرک نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ زندہ نہیں ہیں، پہلے زمانہ میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ نباتات میں زندگی نہیں ہے کیونکہ وہ ایک جگہ قایم رہتے ہیں، لیکن اب یہ انکشاف ہوا کہ نباتات و حیوانات میں بعض اوصاف مشترک ہیں، اس بنا پر زندگی کی دو قسمیں کرلیں ایک زندگی کامل جو حیوانات کی زندگی ہے اور دوسری حیات ناقص، لیکن اب اس سے انکار ممکن نہیں کہ نباتات بھی بالکل اسی طرح زندہ ہیں جس طرح حیوانات بلکہ بعض حیثیتوں سے نباتات میں مقابلتاً حیوانات سے زیادہ زندگی پائی جاتی ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ حیوانات کی زندگی کا مظاہرہ اُن کے حرکت کرنے سے ہوتا ہے اور نباتات اپنی زندگی کو دوسری حیثیت سے نمایاں کرتے ہیں۔ درخت یا پودا اگرچہ بالکل خاموش اور ساکن ہوتا ہے، لیکن اُس کی زندگی بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ وہ بذریعہ غذا حیوان کے جسم میں پہونچ کر اُس کی زندگی قایم رکھتا ہے، بظاہر شیر گھاس نہیں کھاتا لیکن وہ ایسے جانور کھاتا ہے جن کی غذا محض نباتات ہے۔ اس لئے شیر اور ہر گوشت خوار جانور کی زندگی بالواسطہ نباتات ہی پر منحصر ہے۔

بہر حال زندگی صرف چلنے پھرنے یا محض حرکت کا نام نہیں، کیونکہ دنیا کی ہر چیز حرکت میں ہے خواہ ہم اپنی آنکھ سے اُس کو محسوس نہ کر سکیں، وہ چھوٹے چھوٹے ذرات جن سے قدرت نے ایک کنکر طیار کیا ہے حرکت میں ہیں وہ سادہ ذرات

جو اس صفحہ پر سیاہی کا رنگ دے رہے ہیں حرکت میں ہیں، ایٹم کے اندر برقپارے حرکت میں ہیں، سورج، چاند، سیارے سب حرکت میں ہیں، غرض پوری کائنات متحرک ہے۔

یہ صحیح ہے کہ زندگی کو حرکت سے خاص تعلق ہے، لیکن جس حرکت کو زندگی کہ سکتے ہیں وہ خاص قسم کی حرکت ہے اور اسکے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ ہم پہلے نہایت سادہ قسم کی زندگی کا مطالعہ کریں، اور وہ نباتات کی زندگی ہے، سطح زمین پر نباتات کا وجود حیوانات سے کروروں برس پہلے ہو چکا ہے۔ پہلے نباتات کیوں پیدا ہوئے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ سب سے پہلا ذی حیات جو زمین پر نمودار ہوا اُس کی غذا کے لئے صرف بیجان چیزیں ہوا، پانی، نمک جیسی چیزیں موجود تھیں اور وہ زندہ چیز جو اِن اشیاء پر اپنی زندگی قایم رکھ سکتی ہے، صرف نباتات ہی ہو سکتے ہیں۔

اب ہم عالم نباتات کا مطالعہ کرکے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پودوں اور درختوں میں کس طرح تنوع پیدا ہوا، اور کس طرح اُن کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اس سوال کو حل کرنے کے لئے ہم کو علم طبقات الارض سے مدد لینے کی ضرورت ہوگی جس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر قایم ہے، یہ علم ہم کو بتاتا ہے کہ اگر ہم سطح زمین کو کھودتے ہوئے نیچے چلے جائیں، تو ہم کو ایک طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ ملتا چلا جائے گا۔ اور ہر ایک طبقہ یا تہ ایک دوسرے سے مختلف ہوگی۔ وہ طبقہ جو اس وقت سطح زمین کہلاتا ہے اور جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کے نیچے والا طبقہ کسی زمانہ میں سب سے اوپر والا طبقہ تھا جو ارضی انقلابات کی وجہ سے نیچے دب گیا اور اسی طرح اُس کے نیچے والے تمام طبقات ایک زمانہ میں زمین کی اوپر والی سطح بنائے ہوئے تھے۔

اگر ہم زمین کو دور تک نیچے کھودتے ہوئے چلے جائیں تو ہم کو مختلف قسم کے جانوروں اور پودوں کے آثار ملتے چلے جائیں گے جن کو دیکھ کر ہمیں داستانِ زندگی کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ان کے مطالعہ سے ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ سب سے پہلے پیدا ہونے والے پودے کس قسم کے تھے، عالم نباتات میں سب سے پہلے پیدا ہونے والی چیزیں بڑے درخت نہیں تھے اور نہ پھول والے درخت تھے بلکہ وہ سمندر میں پیدا ہونے والی بحری گھاس تھی اور بالکل ہی سادہ قسم کی ـــــ یہ ابتداء میں پیدا ہونے والے پودے بہت چھوٹے تھے، محققین کا خیال ہے کہ یہ اولین جاندار نباتی ہستیاں اُن جراثیم کے مانند تھیں جو آج کل ہمارے جسم میں داخل ہوکر بیماری کا سبب بن جاتے ہیں۔

نباتات کے اس دور پر لاکھوں برس گزرتے چلے گئے اور وہ بتدریج ارتقائی منازل طے کرکے ایسے درخت بن گئے جن کو انگریزی میں ' ' کہتے ہیں، یعنی پودوں کی وہ قسم جن میں پھول نہیں لگتا اور اُن کے جسم میں غذا حاصل کرنے کے لئے رگوں کی طرح نالیاں پائی جاتی ہیں، رفتہ رفتہ اس قسم نے اتنی ترقی کی کہ وہ آگے چل کر عظیم الشان درخت بن گئے۔ اِس نوع کے نباتات کی ترقی کا زمانہ اتنا طویل ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، اس قسم کے نباتات اسوقت بھی زمین کے اندر دفن ہیں، جن کو ہم پتھر کا کوئلہ کہتے ہیں۔

یہ قدیم قسم کے پھول نہ دینے والے درخت ماحول کی تبدیلی سے اپنی زندگی قایم نہ رکھ سکے اور یا تو اُن کی قسمیں بالکل فنا ہو گئیں، یا بہت ہی کم باقی رہ گئیں۔

اِس کے بعد پھول والے درخت رونما ہوئے اور وہ رفتہ رفتہ بغیر پھول والوں کی جگہ لیتے چلے گئے، کیونکہ ان میں نئے ماحول کے اندر زندہ رہنے کی زیادہ صلاحیت پائی جاتی تھی، پھر پھول والے درختوں نے بغیر پھول والوں کی جگہ تو لے لی لیکن وہ ان کو بالکل ختم نہ کر سکے، اس وقت بھی ایسے سادہ اور نیچے طبقے کے پودے پائے جاتے ہیں جو اُن پودوں سے زیادہ مختلف نہیں جن کے آثار زمین کے اندر بہت نیچے پائے جاتے ہیں۔

اب ہم اپنے اس مطالعہ میں ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں، کہ پودے کیونکر زندہ

ہیں اور وہ کس طرح سانس لیتے ہیں اگر ہم پودوں کے سانس لینے کو سمجھ جائیں تو خود ہمارا اور آپ کا سانس لینا بھی سمجھ میں آجائے گا، عام طور پر سانس لینے کا یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ ہم سینے کے اندر پھیپھڑوں میں ہوا داخل کریں اور پھر باہر نکالیں، لیکن درخت میں نہ سینہ ہوتا ہے نہ پھیپھڑا بلکہ بعض جانور بھی ایسے ہوتے ہیں جن میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہوتیں لیکن پھر بھی وہ سانس لیتے ہیں، بات یہ ہے کہ سانس لینے کے مختلف طریقے ہیں، لیکن مقصد سب کا ایک ہی ہے۔

جہاں کہیں کوئی زندہ چیز پائی جاتی ہے خواہ وہ پانی کے اندر ہو، یا پانی سے باہر وہاں ایک خاص قسم کا مادہ پایا جاتا ہے جس کو ہم آکسیجن کہتے ہیں جو زندگی کے لئے ضروری ہے۔ سب سے پہلے پیدا ہونے والے پودے نے پانی سے آکسیجن حاصل کیا تھا لیکن ارتقائی عمل سے جب درختوں نے پانی سے باہر قدم نکالا تو ان سب نے ہوا سے آکسیجن لینا شروع کردیا۔

سانس لینے میں دو عمل ہوتے ہیں، پہلا عمل یہ ہے کہ ہم ہوا کو اندر کھینچتے ہیں، اور اُس سے آکسیجن لیتے ہیں، دوسرا وہ جبکہ ہم اس ہوا کو واپس کرتے ہیں، لیکن واپسی پر وہی آکسیجن ملی ہوئی ہوا واپس نہیں ہوتی، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو سانس لینا ایک بے معنی حرکت ہوتی، بلکہ اُس کے ساتھ ایک اور چیز شامل ہوجاتی ہے جس کو کاربن کہتے ہیں۔

جب حیوان یا نبات کے جسم میں کاربن آکسیجن کے ساتھ مل کر سانس کے ساتھ باہر نکلتا ہے تو وہ ایک خاص قسم کا مادہ بن جاتا ہے، یعنی ایک خاص قسم کی گیس جس کو اصطلاح میں "کاربن ڈائی آکسائڈ" کہتے ہیں، انسان ہو یا حیوان بڑا درخت ہو یا ننھا سا پودا سب کے لئے سانس لینا ضروری ہے، اور اسی پر زندگی کا مدار ہے۔

اگر ہم کسی جانور کو ایک شیشے میں بند کردیں، تو وہ آکسیجن ختم ہونے سے تھوڑی دیر میں گھٹ کر مرجائے گا، اور اس طرح اگر ہم کسی پودے کو بند کردیں تو وہ بھی مرجھاکر ختم ہوجائے گا، لہذا ثابت ہوا کہ حیوان ہو یا نبات دونوں کے لئے سانس لینا ضروری ہے۔

نباتات کو حیوانات کے مقابلہ میں بہت کم آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اُن کی سانس کا عمل آہستہ ہوتا ہے اور اُس کی نوعیت بھی حیوانی سانس سے مختلف ہے۔ نباتات کو دو قسموں میں تقسیم کردیا گیا ہے ایک وہ جس میں Chlorophyll (ہرے رنگ کا مادہ) پایا جاتا ہے دوسرے وہ جس میں یہ مادہ نہیں ہے۔

یہ مادہ سورج کی حرارت اور روشنی سے پیدا ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے درختوں کا رنگ سبز ہوتا ہے، اگر کسی پودے کو آفتاب کی روشنی اور حرارت سے محروم کردیا جائے تو یہ سبز مادہ فنا ہوجائے گا اور اُس کی زندگی بھی ختم ہوجائے گی، اس مادہ کا زیادہ حصہ پتوں میں پایا جاتا ہے اور کمتر حصہ شاخوں اور تنے میں، پتوں کی تخلیق کا مقصد ہی یہی ہے کہ اُنکے ذریعہ سے یہ مادہ پیدا ہوکر بقائے حیات کا سبب بنتا رہے اور یہی وجہ ہے درخت کے پتے چپٹے، پتلے اور کثرت سے ہوتے ہیں، تاکہ اُن کی زیادہ سے زیادہ سطح آفتاب کی روشنی اور حرارت سے استفادہ کرکے اپنے سبز رنگ کے مادے کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرسکے، اگر پتے پھلوں کی طرح گول یا کسی اور شکل کے ہوتے، تو اُن کی بہت کم سطح اس مقصد کے لئے کام آسکتی۔

اب ہم اس سبز مادے کی اہمیت بتانا چاہتے ہیں، سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ سانس لینے کے عمل میں حیوانات اور نباتات کے درمیان ایک خاص اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کی نوعیت یہ ہے کہ حیوان ہوا سے آکسیجن لے کر کاربن باہر کردیتا ہے لیکن نباتات کاربن کا بڑا حصہ اپنے اندر جذب کرکے اُس کو اپنی غذا بنالیتے ہیں۔

تمام جانوروں کو درختوں کی طرح کاربن کی ضرورت ہوتی ہے لیکن محض کاربن حیوان کی غذا اُس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ نباتات کے جسم میں پایا جانے والا ہرا مادہ اُس میں دوسرے مادے شامل کرکے حیوانی غذا بننے کی صلاحیت پیدا نہ کردے، نباتات کے اسی عمل پر کرۂ زمین میں بقائے حیات کا انحصار ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو نباتات کے ایک ایک پتے اور

اُس کی شاخوں میں خاموشی سے جاری ہے، گویا عالم نبات ایک عظیم الشان کارخانہ ہے جو ہمارے لئے غذا فراہم کرنے میں مصروف عمل ہے ——— اگر نباتات اپنے سبز مادہ کے ذریعہ حیوانات کے لئے غذا فراہم نہ کریں تو تمام عالم حیوان ختم ہو جائے اور کرۂ زمین پر زندگی کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

الغرض زندگی کے میدان میں سب سے پہلے نباتات ہی نے قدم رکھا اور زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ ارتقائی منازل طے کرتے چلے گئے یہاں تک کہ نباتات کے اس ارتقائی عمل نے سب سے پہلے حیوان کو پیدا کیا، اور جس طرح رفتہ رفتہ نباتات میں تنوع پیدا ہوا تھا اسی طرح حیوانات میں پیدا ہونے لگا، لیکن یہ سب کچھ پانی کے اندر ہی ہو رہا تھا، ابھی زندگی نے پانی سے باہر قدم نہیں رکھا تھا، آخر وہ وقت بھی آگیا جب نباتات و حیوانات سمندر سے خشکی پر نکلنا شروع ہوئے، یہ ایک بڑا اہم واقعہ تھا لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کاروانِ حیات ایک ہی دن میں سمندر سے باہر نکل آیا، یہ منتقلی نہایت آہستہ اور ایک خاص طریقے سے ہوئی ہے۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ زندگی کو پانی سے خشکی پر لانے میں سب سے بڑا ہاتھ چاند کا ہے، چاند اپنی کشش سے روزانہ سمندر کے پانی کو چوبیس گھنٹے میں ایک دفعہ اوپر کو اُبھار دیتا ہے جس کے اثر سے کناروں کا پانی سمٹ جاتا ہے اور زمین نکل آتی ہے اور جب چاند کرۂ زمین کے دوسرے نصف حصے کے مقابل آتا ہے تو پانی پھر اصل حالت پر آجاتا ہے اور کناروں پر اپنی پہلی جگہ پر پہونچ جاتا ہے، اور اسی عمل کو ہم جزر و مد کہتے ہیں۔

جزر و مد کی وجہ سے جو حیوانات اور نباتات پانی سے باہر خشکی پر رہ جاتے تھے رفتہ رفتہ اُن میں یہ صلاحیت پیدا ہوتی گئی کہ وہ پانی سے باہر بھی زندہ رہ سکیں چونکہ وہ پانی سے بالکل دور نہیں ہوتے تھے بلکہ جس زمین پر وہ پڑے رہ جاتے تھے وہ بالکل خشک نہیں ہوتی تھی، اس لئے زندگی کا سمندر سے باہر نکلنا طبعی قوانین کے تحت دفعتاً نہیں بلکہ تدریجاً ہوتا چلا گیا، اب تک ایسے جانور پائے جاتے ہیں جن کی اصلی جگہ پانی ہے، خاص طور پر وہ اتھلا پانی جو کناروں پر ہوتا ہے یہ جانور پانی سے زیادہ دور خشکی پر نہیں جاتے، یہ چٹانوں پر یا ریت میں سمندر کے کنارے اُس وقت تک پڑے رہتے ہیں جب تک کہ جزر و مد کے عمل سے دوبارہ وہ پانی میں نہ پہونچ جائیں، بعض جانور ایسے بھی ہیں جو پانی سے نکل کر دور تک خشکی میں چلے جاتے ہیں، لیکن اُن کا اصلی وطن چونکہ پانی ہے اس لئے لوٹ کر پھر پانی میں پہونچ جاتے ہیں۔

کروڑوں برس گزرنے کے بعد زندگی سمندر سے خشکی میں پہونچ گئی اور رفتہ رفتہ نباتات اور حیوانات میں ماحول اور دوسرے اثرات سے تنوع پیدا ہوتا چلا گیا، اور ایسے جاندار بہ کثرت پیدا ہوگئے جنھوں نے نہ کبھی سمندر دیکھا تھا اور نہ جزر و مد سے اُن کو واسطہ تھا بلکہ بعض تو ایسے ہیں جو ہفتوں بغیر پانی پئے ریگستانوں میں چلتے رہتے ہیں۔

اب ہم کو اس بات پر غور کرنا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ پانی کے مقابلہ میں خشکی میں زندگی نے زیادہ ترقی کی، اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم کو دیکھنا چاہئے کہ پانی کے اندر بسنے والے جانداروں کو کیوں زیادہ ترقی کرنے کا موقع نہیں ملا پانی کے جانوروں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ جانور مچھلی ہے، لیکن مچھلی چاہے جتنی بڑی ہو اُس میں خشکی کے جانوروں کی طرح ہوشیاری اور احساس نہیں ہوتا، یہ اُسی طرح بے حس اور ٹھنڈی ہوتی ہیں جس طرح اُس کے گرد و پیش کا پانی، ہاں بعض ایسی مخلوق بھی ہے جو مچھلیوں کی طرح سمندر میں رہتی ہیں مگر اس کے جسم میں گرم خون ہوتا ہے — یہ جانور اگرچہ بظاہر مچھلی کی طرح معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ در اصل مچھلی نہیں ہے، ایسے جانوروں میں ہم وھیل مچھلی اور سیل کو شمار کرتے ہیں، ان کا وجود بھی مچھلیوں کے بہت بعد ہوا ہے - اس قسم کے جانور اگرچہ پانی میں رہتے ہیں، لیکن خشکی کے جانوروں کی طرح ہوا سے سانس لیتے ہیں۔

یہ بات تو ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ ہر زندہ چیز کو سانس لینے کی ضرورت ہے اور سانس لینے کے لئے ہر وقت تازہ آکسیجن درکار ہوتی ہے، اب جس مقدار کی آکسیجن کسی جاندار کو اپنے ماحول سے حاصل ہو سکتی ہے اُسی مقدار کے تناسب سے وہ ترقی کر سکتا ہے اس لئے زندگی اُس کروروں برس کی مدت میں جب کہ اُس کا وجود صرف پانی میں منحصر تھا زیادہ ترقی نہ کر سکی، کیونکہ پانی میں ہوا کے مقابلہ میں بہت کم آکسیجن ہوتی ہے۔

پانی میں جس قدر بھی آکسیجن پائی جاتی ہے وہ ہوا سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے سطح کے قریب جو پانی ہوتا ہے اُس میں گہرے پانی کی بہ نسبت زیادہ آکسیجن پائی جاتی ہے، اس لئے جزرومد کے اثر سے پانی میں بسنے والے جانور جب خشکی میں آپڑتے تھے تو وہ رفتہ رفتہ ہوا سے زیادہ آکسیجن لینے کے عادی ہوگئے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ قریب الفہم ہوگا کہ وہ سمندر کو چھوڑ کر خشکی کی طرف قدم بڑھانے لگے، گویا انھوں نے پانی کا سمندر چھوڑ کر ہوا کے سمندر میں غوطہ لگایا اور اس طرح ہوا میں زندگی کی ترقی کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔

پانی سے خشکی میں زندگی کا قدم رکھنا آسان کام نہ تھا کیونکہ پانی کا جانور مثلاً مچھلی پانی سے باہر نکلتے ہی مر جاتی ہے حالانکہ اُس کو بہ نسبت پانی کے ہوا میں کہیں زیادہ آکسیجن ملتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ مچھلی کے جسم میں پھیپھڑا نہیں ہوتا جو ہوا سے آکسیجن حاصل کرنے کا کام دے سکے، بجائے پھیپھڑوں کے مچھلی میں گلپھڑے ہوتے ہیں جو پانی سے قلیل مقدار کی آکسیجن کو چھان کر مچھلی کے جسم میں پہونچا دیتے ہیں اور پانی سے باہر آنے پر وہ اپنا عمل کرنے کے قابل نہیں ہوتے لہذا باوجود آکسیجن کی فراوانی کے مچھلی ہوا میں گھٹ کر مر جاتی ہے۔

پانی سے خشکی میں آنے کے بعد جب جانوروں نے آکسیجن بہ کثرت حاصل کرنا شروع کیا تو حرارت کا ذخیرہ بھی جسم کے اندر بڑھ گیا۔ حیوانات اور نباتات نے اگرچہ سمندر سے باہر نکل کر بڑی ترقی کی ہے لیکن وہ اپنی زندگی قایم رکھنے میں اس طرح پانی کے محتاج ہیں جس طرح سمندر میں رہنے والے جاندار۔ زندگی اب بھی پانی ہی کے اندر ہے ہمارے جسم میں ایک بڑی مقدار پانی کی ہر وقت موجود رہتی ہے اور اُس پانی میں اُسی قسم کے نمک پائے جاتے ہیں جو سمندر کے پانی میں ہیں، خاص کر کھانے کا نمک جس طرح سمندر کے پانی میں بہ کثرت موجود ہے اسی طرح ہمارے جسم کے پانی میں بھی پایا جاتا ہے اور اُس کا وجود حیوانی زندگی کے لئے لازمی ہے اس لئے انسان ہو یا حیوان، چرندہ ہو یا پرندہ اپنا سمندر اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے اور زندگی کو اب بھی پانی ہی کے اندر سمجھنا چاہیے۔

اب نباتات کو چھوڑ کر حیوانات کی طرف آئیے سب سے پہلے پیدا ہونے والے جانور نہایت سادہ قسم کے تھے، اُن میں ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی تھی، یہ چیز جانوروں میں بہت عرصہ کے بعد پیدا ہوئی ہے اور اس اعتبار سے جانوروں کی تقسیم ریڑھ والے اور بغیر ریڑھ والے جانوروں میں کی جاتی ہے اور کچھ ایسے جانور بھی پائے جاتے ہیں جن کو ان دونوں میں سے کسی قسم میں نہیں رکھا جا سکتا، یہ دراصل بیچ کی کڑی ہیں اور اُن میں کچھ ناتمام سی ریڑھ کی ہڈی پائی جاتی ہے، ان جانوروں کا مطالعہ نہایت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ہم ان کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ کس طرح رفتہ رفتہ ریڑھ کی ہڈی جانوروں میں پیدا ہوئی کروروں برس گزرنے کے بعد بھی سمندر اور خشکی میں ایسا کوئی جانور نہ پایا جاتا تھا جو ریڑھ کی ہڈی رکھتا ہو اور اُس کے اندر دماغ بھی ہو۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ دماغ نہ ہونے کی وجہ سے یہ کسی چیز کو محسوس ہی نہیں کر سکتے ان کے احساس کا نظام بالکل دوسرا ہے، اور اِن میں سے بعض مثلاً بھڑ یا شہد کی مکھی وغیرہ خاصی ترقی یافتہ زندگی گزارتی ہیں، لیکن پھر بھی ریڑھ اور دماغ نہ ہونے کی وجہ سے یہ جانور عالم حیوانات میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کو آسانی سے پانچ قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے، مچھلیاں[1] - پانی اور خشکی دونوں میں

رہنے والے جانور - رینگنے والے[۳] جانور - پرندے[۴] اور دودھ[۵] پلانے والے جانور -

بظاہر مچھلی، گائے، چڑیا، مینڈک، اور سانپ میں بہت فرق ہے، لیکن جہاں تک ان کے جسم کی ساخت اور ڈھانچہ کا تعلق ہے ان سب میں مشابہت پائی جاتی ہے، کیونکہ ان سب کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی پائی جاتی ہے، یہ صحیح ہے کہ مچھلی 'ٹھنڈے خون والا' جانور ہے اور وہ پانی کے اندر ہی سانس لیتی ہے، برخلاف اس کے گائے گرم خون والا جانور ہے اور ہوا میں سانس لیتا ہے، لیکن جہاں تک ان کی جسمانی ساخت کا تعلق ہے، یہ ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔

اب ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کی تاریخی ارتقا پر غور کیجئے، ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ترقی سب سے پہلے مچھلی میں پیدا ہوئی، مچھلی کی ریڑھ کی ہڈی پر اُس کے جسم کی تعمیر قایم ہے، اُس کے ڈھانچے کا اہم ترین حصہ ریڑھ کی ہڈی ہے، اور مچھلی کا یہ ڈھانچہ ایک نرم مادہ اور کھال وغیرہ سے ڈھکا ہوا ہے، جسمانی ساخت کی یہ ترکیب تمام ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

رینگنے والے جانوروں کو (جن کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے مثلاً سانپ) چھوڑکر باقی سب ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے جانور دو ہاتھ، دو پاؤں، یا اگلے پاؤں اور پچھلے پاؤں یا بازو اور پاؤں رکھتے ہیں، یہ ہاتھ، پاؤں اور بازو کس طرح پیدا ہوئے یہ حیوانی جسم کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھنے والا سوال ہے، ان ہاتھ پاؤں یا بازوؤں کی ابتدا مچھلی کے پروں (Fins) سے ہوئی ہے، بعض مچھلیاں سر سے دُم تک بہت لمبے لمبے پر رکھتی تھیں، یہ مچھلیاں اونچے قسم کے ہاتھ پاؤں والے جانوروں کے بننے میں پہلی کڑی کی حیثیت رکھتی ہیں، ان مچھلیوں کے یہی پر کروروں برس گزرنے پر ارتقائی عمل سے ہاتھ پاؤں میں تبدیل ہوگئے۔ جو تمام ریڑھ والی ہڈی رکھنے والے جانوروں میں پائے جاتے ہیں۔

وہ مچھلیاں جو دیر تک پانی کے باہر رہ سکتی ہیں اور وہ جانور جو پانی اور خشکی دونوں میں زندہ رہتے ہیں جیسے مینڈک اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ زندگی نے کس طرح پانی سے باہر قدم نکالا اور ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے جانوروں کے عظیم سلسلہ نے کس طرح ارتقائی منازل طے کرنا شروع کئے، مینڈک کا چھوٹا بچہ جس کو بلبلیا یا (Tadpole) کہتے ہیں، مچھلی کی طرح ہوتا ہے اُس کے دُم اور گلپھڑے ہوتے ہیں اور پانی کے اندر ہی مچھلیوں کی طرح سانس لیتا ہے اور جب تک اُسکے ہاتھ پاؤں نہیں نکلتے وہ مچھلی ہی ہوتا ہے، پھر جب رفتہ رفتہ اُس میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور ہاتھ پاؤں بلکہ اُنگلیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور پھیپھڑا پیدا ہوکر آزادی سے ہوا میں سانس لینے لگتا ہے تو مینڈک بن جاتا ہے اور مچھلی نہیں رہتا، اسی مینڈک سے تمام ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں میں ہاتھ پاؤں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

مینڈک ریڑھ والے جانوروں کی پہلی ترقی یافتہ شکل ہے کیونکہ اب اس کے ہاتھ پاؤں نکل آئے، اور وہ ہوا میں پھیپھڑوں کے ذریعہ سے سانس لینے لگا اور اب وہ آیندہ ترقی کرنے والے جانوروں سے قریب ہوگیا، جن کو Reptile کہتے ہیں یعنی وہ جانور جو یا تو پیٹ کے بل گھسٹتے ہیں، جیسے سانپ یا چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں رکھتے ہیں جیسے چھپکلی، گرگٹ، گوہ، مگرمچھ وغیرہ۔

مینڈک اپنی ابتدائی شکل میں مچھلی ہوتا ہے، اور جب بڑا ہوجاتا ہے تو وہ Amphibia کی جنس میں شامل ہوجاتا ہے اور یہیں سے Reptile جانوروں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ Reptile میں ایک قسم ایسی بھی ہے جس نے اپنے ہاتھ پاؤں کھودئے اگرچہ اُس کے آبا و اجداد میں ہاتھ پاؤں پائے جاتے تھے اور اس قسم میں سانپ اور سانپ کے خاندان کے تمام رینگنے والے جانور شامل ہیں۔

Reptile کی دوسری قسم یعنی ہاتھ پاؤں والی قسم بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ حیوانی تاریخ

میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جبکہ صرف Reptilia جانوروں کی حکومت تھی بعض ان میں سے بڑے خوفناک اور عظیم الجثہ ہوتے تھے، ان کی ہڈیوں کے ڈھانچے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، اُن میں بعض ساٹھ فٹ تک لمبے پائے گئے ہیں اب آپ ذرا تصور کیجئے ساٹھ فٹ لمبے ڈھانچے پر جب گوشت اور پوست ہوگا تو کیسا بھیانک معلوم ہوتا ہوگا، ان میں سے بعض کے نہایت تیز قسم کے بہت سے دانت بھی ہوتے تھے ان جانوروں نے ایک طویل عرصہ تک زمین پر قبضہ کر رکھا تھا اس زمانہ کو زمین کی تاریخ میں Reptilia دور کہتے ہیں۔

جب زندگی کو پانی سے خشکی میں آئے ہوئے لاکھوں برس گزرجاتے ہیں تو ایک قدم اور آگے بڑھاتی ہے یعنی زمین سے اٹھکر ہوا میں پہونچنے کی کوشش کرتی ہے، بعض ریپٹائل جانوروں کے ڈھانچوں سے جو صرف گزشتہ صدی میں ملے ہیں یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ اُن کی انگلیوں کے درمیان کھال کا ایک پردہ جیسا جڑا ہوا تھا، جیسا کہ تیرنے والے پرندوں کے پنجوں میں ہوتا ہے، یہی چیز آگے چل کر پروں میں تبدیل ہوگئی اور ریپٹائل ترقی کرکے پرندہ بن گیا، بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے ——— ایک کبوتر اور ایک سانپ یا چھپکلی کی ساخت میں بڑا فرق ہے، سب سے بڑا فرق تو یہی ہے کہ ریپٹائل کے دانت ہوتے ہیں اور کوئی پرندہ دانت نہیں رکھتا، لیکن پھر بھی واقعہ یہی ہے کہ پرندہ، ریپٹائل کی ترقی یافتہ صورت ہے اور اب تو یہ بات اس وجہ سے اور بھی یقینی ہوگئی کہ بعض ایسے پرندوں کے ڈھانچے مل گئے ہیں جن کے دانت ہوا کرتے تھے، اس قسم کے پرندے گویا ریپٹائل اور پرندوں کی درمیانی کڑی ہیں۔

گزشتہ تمام تفصیل کو خلاصہ کے طور پر یوں سمجھنا چاہئے کہ مچھلیوں سے Amphibia قسم کے جانور (یعنی وہ جو پانی اور خشکی دونوں میں زندہ رہتے ہیں) پیدا ہوئے اور Amphibia سے Reptilia پھر بعض ریپٹائل سے پرندے اور بعض سے Mammals یعنی دودھ پلانے والے جانور پیدا ہوئے، تمام جانوروں میں یہی آخری قسم سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، اور اسی قسم کی ایک سب سے اعلیٰ قسم حضرت انسان ہے۔

ابتدا میں دودھ پلانے والے جانوروں کی زندگی ضرور دشوار رہی ہوگی، کیونکہ اُس دور میں بڑے بڑے ہولناک ریپٹائل کثرت سے زمین پر پائے جاتے تھے، اس لئے کچھ تو اپنے بچاؤ کے لئے اور کچھ اس لئے بھی کہ دودھ پلانے والے جانور سب سے زیادہ اپنے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کرتے ہیں، یہ دودھ پلانے والے زمین کے ایسے گوشوں میں رہنے پر مجبور ہوئے جہاں ریپٹائل کا گزر نہیں ہوتا تھا، رفتہ رفتہ ان کی قوت بڑھتی گئی اور زمین پر ان کا تسلط ہوتا گیا، یہانتک کہ سب سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ جانور یعنی انسان زمین پر چھا گیا۔

محمود علی خاں

"نگار" کے حسب ذیل پچھلے مکمل فائلوں کی صرف ایک ایک جلد موجود ہے

سنہ ۳۶ء (مع ہندی شاعری نمبر) ---------- بیس روپے

سنہ ۳۷ء (مع اصحاب کہف نمبر) ---------- پندرہ روپے

سنہ ۴۶ء (مع انتقاد نمبر) ---------- پندرہ روپے

سنہ ۴۷ء (مع ماجدولین نمبر) ---------- پندرہ روپے

منیجر نگار

صوبۂ بہار میں غالب کی مقبولیت

ہندوستان کے شعرا میں جو مقبولیت غالب کو حاصل ہوئی کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوئی، حالی کی 'یادگار غالب' سے لیکر اس وقت تک غالب اور اس کی شاعری کے متعلق جو تذکرے اور مقالے لکھے گئے ہیں ان کی تعداد سیکڑوں تک پہونچ گئی ہے اور آئے دن ایک نہ ایک مضمون شایع ہوتا رہتا ہے۔ غالب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو کا یہی ایک ایسا شاعر ہو جسکے دقیق اشعار کی شرحیں اُردو میں لکھی گئیں۔ اس بارے میں وحیدالدین بیخود اور حسرت موہانی کی شرحیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۱۹۱۲ء میں جب مولانا محمد علی نے کلکتہ سے کامریڈ نامی انگریزی اخبار نکالا تو اس میں کمتر ان کی کوئی تحریر ہوتی تھی جس میں غالب کا کوئی حسب حال شعر انگریزی شرح کے ساتھ نہ ہوتا ہو۔

لیکن یہ تو تمہیدی بیان تھا۔ مجھے صوبہ بہار میں غالب کی مقبولیت کا حال لکھنا ہے۔ کسی تذکرے میں غالب کا عظیم آباد یا صوبۂ بہار میں آنا مذکور نہیں، آب حیات اور تاریخ ادب اُردو (مترجمہ مرزا عسکری) میں صرف اس قدر لکھا ہے کہ غالب نے اپنی جاگیر حاصل کرنے کی کوششوں کے سلسلہ میں ۱۸۲۳ء میں دہلی سے کلکتہ کا سفر کیا اور اثنائے راہ میں لکھنؤ اور بنارس کی بھی سیر کی۔ لیکن غالب کے فارسی کلیات میں ایک شعر موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے سون ندی (سوہن) کا پانی پیا تھا۔ چنانچہ یوں کہا ہے:-

مرحبا سوہن و جاں بخشیِ آبش غالب خندہ بر گمرہیِ خضر و سکندر دارم (کلیات صفحہ ۱۰۴)

یعنی سون ندی اور اس کے جاں بخش پانی کو مرحبا، جس کو پی کر مجھے خضر و سکندر کے آب حیواں کی تلاش میں گمراہ رہ جانے پر ہنسی آتی ہے۔

یہ سون ندی اضلاع عظیم آباد اور شاہ آباد (آرہ) کے درمیان واقع ہے۔ بظاہر سون ندی کے مصفا اور شیریں پانی کی کیفیت دہلی تک اس قدر مشہور نہ تھی کہ وہاں کا کوئی شاعر خاص طور پر اس کا ذکر کرے۔ لہذا یقین ہوتا ہے کہ بنارس سے کلکتہ جاتے ہوئے غالب نے ضلع شاہ آباد (آرہ) یا عظیم آباد (پٹنہ) میں قیام کیا۔ کلیات میں اس مقطع کے بعد جو غزل ہے اس کے مقطع میں کلکتہ کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ دونوں غزلیں اسی سفر سے تعلق رکھتی ہیں۔ بنارس سے کلکتہ کی راہیں صوبۂ بہار ہی سے ہوکر نکلتی ہیں، ۱۸۶۲ء سے پہلے بنارس سے کلکتہ تک ریل نہ تھی اس لئے سفر کے دو ہی ذریعے تھے ایک تو گنگا ندی سے بذریعہ کشتی دوسرے شیر شاہی سڑک (گرانڈ ٹرنک روڈ) سے بذریعہ رتھ یا یکہ۔ غالباً غالب نے خشکی ہی کی راہ اختیار کی ہوگی اور شہسرام سے چار کوس پورب ڈیہری نامی مقام میں سون ندی کا پانی پیا ہوگا۔

بہرکیف، یوں تو ۱۸۲۳ء کے قبل غالب صوبۂ بہار میں ایک صاحب طرز شاعر اور مسلم الثبوت استادِ فن تسلیم کرلئے گئے تھے مگر میں اس وقت ان مشاہیر شعرائے بہار کا ذکر کروں گا جو غالب کے اتباع یا تلمذ کو طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ ان میں سے بعض کو تو میں نے خود دیکھا تھا اور ذاتی طور پر جانتا تھا جس کی کیفیت ابھی عرض کروں گا اور بعضوں کے حالات نہایت تحقیق کے ساتھ معتبر اور قابلِ وثوق ذرایع سے معلوم کرکے اور ان کے غیر مطبوعہ کلام کا مطالعہ کرکے اپنی یادداشت

میں قلمبند کرائے تھے - لہذا ان کا تذکرہ تفصیل وار عرض کرتا ہوں -

(۱) مکرم تخلص، اکرام الدولہ اکرام الملک مکرم علی خاں بہادر شیر جنگ نبیرہ معظم علی خاں بہادر کانی (قوم افغان) قصبہ بہار شریف میں پہاڑی پر ان کے مکان کے کچھ کھنڈر اب سے پچیس تیس سال قبل راقم نے دیکھے تھے - ان کی آبائی جائداد ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ضبط ہوگئی تھی - اُس کے بعد کچھ عرصہ تک یہ لکھنؤ اور دہلی میں رہے پھر سرہند پہونچے جہاں والی ریاست راجہ نرندر سنگھ کی بدولت کچھ دن اوقات خوشحالی سے بسر ہوئی - آخر میں پھر بہار واپس آئے - مکرم نے ان واقعات کو ایک قصیدہ میں نظم کیا ہے - ان کے قصاید میں چند قصیدے بادشاہ اور مرزا فخرو ولی عہد کی مدح میں ہیں - اُردو کلام جو مختصر ہے اس میں ایک غزل کا مقطع یہ ہے :-

ہے مکرم میکشوں کو میکدہ مثل حرم طاق ابروئے مغاں انکے لئے محراب ہے

ان کے کلیات کا قلمی نسخہ خانقاہ محلہ بارہ دری بہار شریف میں راقم کی نظر سے گزرا اس کا دوسرا نسخہ شاید کہیں نہ ہوگا اس نسخہ پر ان کی مہر بھی ثبت ہے جس میں سنہ ۱۲۶۵ھ درج ہے -

یہ خود کو خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا خانہ زاد لکھتے تھے اکثر فارسی غزلوں کے مقطع میں بادشاہ کی تعریف یا ذکر ہے چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ ہے :-

باشد مکرم الشعرا خانہ زاد شاہ در آرزوئے خویش از و مورد عطا

مکرم، غالب کے شاگرد تھے یا نہ تھے یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا - محض زبانی روایتوں پر پورا بھروسا نہیں اور ان کا کلیات بالاستیعاب دیکھنے کا موقع نہ ملا لیکن یہ معلوم ہے کہ انھوں نے غالب کی اس غزل پر جس کا مطلع یہ ہے مصرعے لگائے تھے :-

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

یہ ہر کام میں بادشاہ کی پیروی کو باعثِ فخر سمجھتے تھے اس لئے گمان ہوتا ہے کہ جب ظفر نے غالب سے اصلاح لینا شروع کی تو انھوں نے بھی اپنا کلام غالب کو دکھایا ہوگا - بہرکیف غالب کی غزل پر مصرع لگانا جو اوپر مذکور ہوا اس سے غالب کی شہرت اور مقبولیت ثابت ہے، مکرم کا سن وفات صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ بڑی عمر پاکر انتقال کیا -

(۲) شیر تخلص، سید محمد شیر نام متوطن قصبہ بہار شریف - سید محبوب شیر صولت رئیس عظیم آباد (جن کا دیوان طبع ہوچکا ہے) کے خویش اور اپنے زمانہ میں مشہور خوشگو شاعر تھے - غالب اور وحید الہ آبادی سے تلمذ تھا - افسوس ہے کہ جن لوگوں سے مزید حالات معلوم ہوسکتے تھے وہ ترک وطن کرکے یہاں سے چلے گئے - میری یادداشت میں انکا ایک شعر موجود ہے جس کو اس جگہ نقل کرتا ہوں :-

ہم کو دلیل عشق حقیقی ہوا مجاز آوارگی نے کام دیا خضرِ راہ کا

(۳) کرامت تخلص سید شاہ کرامت حسین ہمدانی نام ساکن بہار شریف محلہ اصل گڑھی - مخدوم سید ہمدانی عرف حضرت منجھن کی اولاد سے تھے - ۱۱۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا - ایک غیر مطبوعہ دیوان یادگار چھوڑا جو غالباً ان کے ورثا کے پاس موجود ہوگا مرحوم احقر بہاری سے سنا گیا تھا کہ غالب کے راسخ الاعتقاد تلامذہ میں تھے اور کسی سے اصلاح سخن نہ لی - ان کا یہ شعر بہار کے بعض کہن سال بزرگوں کو اب تک یاد ہے :-

مری ہچکیوں کے شمال نکل آئیگا کلیجا جو یہی رہے گی حالت جو یہی رہیگا رونا

(۴) باقرؔ تخلص، سید شاہ باقر حسین نام ولد سید شاہ وارث علی اشکیؔ - ساکن پیر بیگہ ضلع گیا - غالبؔ سے اصلاح سخن لیتے تھے - ان کے نام غالبؔ کے کچھ خطوط بھی تھے جو غالباً ان کے پسر اوسط خاں بہادر عبدالصمد صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے پاس ہوں گے - بیشتر فارسی میں کہتے تھے اُردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

شکل تصویر ہو خاموش تماشا کیا ہے   بیٹھے بیٹھے کھنچے جاتے ہو یہ نقشا کیا ہے

حضرت باقرؔ کے والد شاہ وارث علی اشکیؔ صوبۂ بہار کے مشاہیر اہلِ علم میں تھے - شادؔ عظیم آبادی نے حیات فریاد میں لکھا ہے کہ ان کے استاد حضرت فریادؔ نے بیشتر تعلیم اپنے ماموں شاہ وارث علی اشکیؔ سے پائی تھی -

(۵) خلیلؔ و فوقؔ تخلص، اور محمد ابراہیم نام ساکن شہر آرہ محلہ چوک مسجد - ۱۸۶۷ء کے قبل سے اپنے کلام کی اصلاح غالبؔ سے لیتے تھے - اسی سلسلہ میں ایک بار انھوں نے اپنا کلام اصلاح کے لئے غالبؔ کے پاس بھیجا تو اس کے ساتھ فارسی میں ایک خط بھی لکھا جس میں یہ عبارت تھی :-

" بہر حال ملازمان گرامی زحمت اصلاح و ملاحظہ غزل دادن و علاوہ از خرچ محصول ڈاک انچہ بروانی نامہ ہا گردد زیر بار نمودن اینجا غیر از مزید تفقد یا حیلۂ تلمذ حقے کدام "

غالبؔ کو یہ جملہ بہت ناگوار ہوا، اس عبارت پر نشان بناکر حسب ذیل جواب کے ساتھ خط کو واپس کر دیا :-

" منشی محمد ابراہیم صاحب خلیل تخلص کو غالبؔ ہمیند بازاری فرومایہ کا سلام - خط کی پشت پر جواب لکھنے کی غرض یہ ہے کہ جس عبارت پر ــہ کا ہندسہ ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے - جس شخص کا سیکڑوں روپے مہینے کا صرف ہو اس کو دو چار آنوں میں زیر باری کا لفظ لکھنا گالی دینے سے بدتر ہے یہ کوئی دوکاندار کسی اپنے بھائی دوکاندار کو لکھے - بہر حال بموجب آپ کی رائے کے زیر بار نہیں ہوتا اور آپ کا مجموعہ اشعار بیرنگ بھیجتا ہوں ۱۲ عفو جرم کا طالب غالبؔ ۱۲ - جمعہ ۴ جنوری ۱۸۶۷ء "

غالبؔ کا خط فوقؔ کے کلیات (صفحہ ۱۴۵) میں چھپ کر شایع ہو چکا ہے لیکن اس کا حال باہر والوں کو بہت کم معلوم ہے اس کلیات کے آخر میں صفیرؔ بلگرامی کا قطعہ تاریخ بھی موجود ہے جس میں انھوں نے خود کو " شاگرد حضرت غالبؔ دہلوی " لکھا ہے فوقؔ کے دیوان سے ایک اُردو شعر بطور نمونہ درج کرتا ہوں :-

مے ہو جب خونِ جگر ہجراں میں   منتِ پیر مغاں کیا کیجے

(۶) صفیرؔ تخلص، سید فرزند احمد (بلگرامی) نام نہ صرف صوبۂ بہار بلکہ ہندوستان کے مشاہیر شعرا اور اہلِ قلم سے تھے ۱۲۴۹ھ میں مارہرہ میں پیدا ہوئے اور پانچ برس کی عمر میں آرہ چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے، ان کی تصانیف میں رفیض صفیر، رسالہ تانیث و تذکیر اور تذکرہ 'جلوۂ خضر' زیادہ مشہور ہیں - اول الذکر کو حضرت جلال کے رسالہ پر بھی سبقت حاصل ہے اس رسالہ پر غالبؔ نے تقریظ بھی لکھی ہے جو اس رسالہ کے علاوہ غالبؔ کی عود ہندی میں بھی موجود ہے ---

--- غالبؔ سے تلمذ حاصل کرنے اور دہلی جاکر دو ڈھائی مہینے تک غالبؔ کے ہاں ایک معزز مہمان کی طرح رہنے کا حال جلوۂ خضر صفحہ ۲۲۱ میں مذکور ہے - اس کا ملخص یہ ہے کہ صفیرؔ ۱۲۸۰ھ میں مارہرہ گئے تو اپنے نانا صاحبِ عالم صاحب کے ہاں غالبؔ کی شاعری کا چرچا دیکھ کر ان کو بھی تلمذ حاصل کرنے کا اشتیاق ہوا اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی اور دو غزل اُردو غالبؔ کے پاس اصلاح کے لئے بھیجیں - غالبؔ اصلاح دیکر آٹھویں دن غزلیں واپس بھیجدیں، پھر انھوں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پر کہکر اصلاح کے لئے بھیجا اور اس کے بعد ۱۲۶۸ھ میں اپنے ماموں کے ساتھ دہلی گئے اور دو ڈھائی مہینے غالبؔ کے مہمان رہے اور رسالہ فیض صفیر پر تقریظ بھی لکھوائی اس کے بعد غالبؔ کی حیات تک خط کتابت کا سلسلہ جاری رکھا -

صفیر مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ صوبۂ بہار اور یوپی میں خود صفیر کے شاگرد بہت تھے سخن گوئی کی مشق اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ بیالیس برس کی عمر میں آٹھ دیوان مرتب ہوگئے تھے جیسا کہ خود کہا ہے:-

عمر تیری یہ بیالیس برس کی ہے صفیر — آٹھواں فضل الٰہی سے ہے دیواں تیرا

صفیر نے ۱۲۹۰ھ میں عظیم آباد میں انتقال کیا اور آرہ میں مدفون ہوئے۔ صوبۂ بہار میں صفیر کے تلامذہ کی کثرت خود ان کی اور غالب کی مقبولیت کا پتہ دیتی ہے۔

(۷) صوفی تخلص اور شاہ فرزند علی نام، مشہور قصبہ منیر (مضاف عظیم آباد) کے مخدوم زادوں میں تھے ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ درسیات سے فارغ ہوکر مشقِ سخن شروع کی اور غالب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنی کتاب وسیلۂ شرف (مطبوعہ) میں جو مخدوم شرف الدین احمد بہاری کے حالات میں ہے ضمناً لکھا ہے کہ غالب کے جو خطوط ان کے پاس آتے تھے ان میں سے ایک خط کے لفافہ پر قصبۂ منیر کی میم کو پیش دیکر مُنیر لکھا تھا جس سے ان کو گمان ہوا کہ شاید اس کا صحیح نام مُنیر ہی ہوگا۔

جس زمانہ میں غالب کے دقیق اشعار پر لوگ معترض ہوئے اور کہا کہ:-

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے — مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

تو صوفی نے حق تلمذ ادا کرنے کے لئے اس کے جواب میں رباعیاں کہیں ان میں سے ایک رباعی پر غالب نے صاد دیا تھا۔ وہ رباعی یہ ہے:-

سب تیغ زباں سے انھیں پہچانتے ہیں — غالب وہ ہیں سب اہل سخن جانتے ہیں
یہ شیر خدا کے نام کی ہے برکت — لوہا اسداللہ کا سب مانتے ہیں

دیوان فارسی و اُردو کے علاوہ تین مثنویاں۔ روشِ عشق، کشش عشق اور لواء عشق صوفی کی تصنیف سے یادگار ہیں آخر الذکر مثنوی کے اس شعر پر غالب نے تین صاد بنائے تھے۔

نورِ حق، جلوۂ رب، شانِ الٰہ — ہے تو بندہ مگر اللہ اللہ

صوفی نے ستر سال کی عمر میں ۱۳۱۸ھ انتقال کیا۔ کلیات (غیر مطبوعہ) اب سے بیس برس قبل تک محفوظ تھا اور غالباً اب تک ان کے ورثا کے پاس موجود ہے۔

(۸) سخن تخلص اور خواجہ فخرالدین حسین نام۔ ان کا دولت کدہ بخشی محلہ عظیم آباد میں راقم کے مکان سے بہت ہی قریب تھا اور راقم کے بزرگوں سے مخلصانہ ربط ہونے کے سبب ان کے ہاں راقم کی آمد و رفت تھی اور حضرت سخن راقم کو بزرگانہ شفقت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے خواجہ معین الدین حسین جن کی عمر اس وقت ستر سال کے قریب ہے راقم کے بڑے مخلص دوستوں میں ہیں۔ لہٰذا سخن کے متعلق جو کچھ عرض کروں گا وہ خود ان کی زبان سے سنی ہوئی باتیں ہیں یا جو میں نے خود دیکھا یا ان کے خاص عزیزوں اور دوستوں سے معلوم کیا۔

خواجہ صاحب ۱۲۵۸ھ کے لگ بھگ دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب (ابن ابوالقاسم نظام الدین احمد رضوی المعروف بہ خواجہ فقیر چشتی مودودی) تھا۔ سولہ برس کی عمر میں مختلف اساتذہ سے درسی کتابیں پڑھکر غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ غالب کو نانا کہتے تھے لیکن صحیح طور پر معلوم نہیں کہ واقعی رشتہ مندی تھی یا ان کے حقیقی نانا سے مخلصانہ ربط ہونے کے سبب ایسا تھا۔ بہرکیف سخن کو سترھواں سال تھا کہ غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات پیش آئے اور ان کے والد ان کو ساتھ لیکر لکھنؤ چلے آئے اسی زمانہ میں انھوں نے دہلی کی مفارقت کے بیان میں ایک غزل (زبانِ دہلی اور مکانِ دہلی) لکھی اور اس پر اصغر علی خاں نسیم دہلوی سے جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں تھے اصلاح

لی - کچھ دنوں کے بعد ۱۲۷۶ھ میں یہ اپنے پھوپھا کے ساتھ آرہ چلے آئے اور یہاں وکالت کا امتحان پاس کرکے عدالت میں وکالت کرنے لگے کچھ عرصہ کے بعد حکام کی سفارش سے منصفی کے عہدہ پر مقرر ہوگئے اور ہنگام ملازمت میں انگریزی تعلیم حاصل کرکے صدر اعلیٰ (سب جج) ہوگئے ۱۲۷۶ھ سے انھوں نے مستقلاً صوبۂ بہار ہی کو اپنا وطن قرار دیا۔ شعر و سخن کا مشغلہ تاحیات جاری رکھا۔ صاحب تلامذہ بھی تھے اور اکثر شاگردوں کی غزلیں اصلاح کے لئے آیا کرتی تھیں۔ ۱۲۸۲ھ میں ایک ضخیم دیوان مرتب کرلیا تھا جس پر غالب نے تقریظ لکھی تھی جو اس دیوان کے ساتھ ۱۳۰۲ھ میں شایع ہوئی، دوسرا دیوان (غیر مطبوعہ) بھی مرتب تھا جس کو راقم نے خود دیکھا تھا، ان کے چھوٹے صاحبزادے بیان کرتے تھے کہ ایک شخص نے ان کے بکس سے چرالیا۔ اس بارے میں عجیب گل کھلے اور اشتہارات بھی شایع ہوئے۔

سخن نے رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب کے جواب میں سروش سخن لکھی جو لکھنؤ میں متعدد بار طبع ہوچکی ہے۔ اس کا ذکر تاریخ ادب اردو (مترجمہ مرزا عسکری) میں بھی موجود ہے، یہ کتاب بھی غالب کی اصلاح دادہ ہے۔ اخیر عمر میں سخن نے تہذیب النفوس لکھی جو اس زمانہ میں اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھی۔

سخن کے نام غالب کے چند خطوط بھی تھے جس کو وہ بڑی حفاظت سے رکھتے تھے۔ ان کے انتقال یعنی ۱۹۰۰ء کے بعد وہ خطوط ان کے خویش مولوی خلیل احمد مرحوم کلکتہ لے گئے تھے۔ اس زمانہ میں مرزا عسکری مرحوم بھی کلکتہ میں تھے وہ سخن کے قرابت مندوں میں تھے جس کا ذکر انھوں نے تاریخ ادب اردو میں بھی کیا تھا، راقم کو اول مولوی خلیل احمد مرحوم کے ہاں مرزا صاحب سے نیاز حاصل کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ افسوس کہ اب اُن خطوط کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ ۱۹۴۵ء میں راقم بمبئی گیا تو مولوی خلیل احمد مرحوم کے صاحبزادے شرف الدین خلیل سلمہ کے ہاں ٹھہرا اور ان سے خطوط کا حال دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میرے والد کی کوئی کتاب یا کوئی کاغذ میرے قبضہ میں نہ آیا میں علی گڑھ میں تھا اور کلکتہ میں کسی نے ایک تنکا بھی گھر میں نہ چھوڑا، یہ بھی نہ معلوم ہوسکا کہ کون لے گیا، سخن، غالب کے اس خط کا ذکر بہت فخر سے کرتے تھے جس میں غالب نے خود کو انکا جد فاسد لکھا تھا ایک خط کے ساتھ سخن کی وہ غزل بھی تھی جس کے اس شعر پر غالب نے تین صاد بنائے تھے:۔

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر — ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

راقم نے اس بار ان کو مشاعرہ میں بھی پڑھتے ہوئے سنا تھا۔

دیوان سخن پر سید شاہ محمد یحیٰی صاحب مرحوم (سجادہ نشین خانقاہ ابوالعلائیہ محلہ شاہ کی املی عظیم آباد پٹنہ) نے نظم میں تقریظ لکھی تھی جس کے ایک شعر میں غالب کا بھی ذکر ہے اور حاشیہ پر یہ عبارت ہے۔

ہمہ شوخیٔ غالب دہلوی۔ چو صہبا بریزد زجام سخن۔ (سخن تلمیذ نواب اسداللہ خاں غالب اند ۱۲)

یہ تقریظ شاہ صاحب مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہے راقم کے پاس موجود ہے۔

(۹) شاد تخلص اور انور علی نام۔ راقم کے بزرگوں سے کافی ربط رکھتے تھے، ۱۹۰۰ء میں ان کی عمر تخمیناً ساٹھ برس ہوگی، ابتدا میں غالب سے بذریعہ خطوط اصلاح لیتے تھے پھر مرثیہ گوئی کی طرف طبیعت مایل ہوئی اور مرزا دبیر سے اصلاح لینے لگے اخیر عمر میں طبیعت تصوف کی طرف مایل ہوگئی تھی اور مشق سخن بالکل ترک کردی تھی۔ خود کوئی ذکر کم تر چھیڑتے تھے لیکن دوسروں کی گفتگو توجہ سے سنتے تھے اور چنچے تلے الفاظ میں کوئی چست فقرہ اکثر زبان پر لاتے تھے۔ عظیم آباد کے مشہور اور صاحب تلامذہ شاعر تھے۔ ان کے شاگردوں میں واعظ الدین واعظ عرف بلٹومیاں نے رسالہ مغالطہ شاد لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے کہا تم نے یہ رسالہ بغیر مجھ سے پوچھے کیوں لکھا۔ آخر بڑے اصرار پر انھوں نے اس مضمون کی عبارت لکھی کہ اسکے نفس مضمون سے مجھے کوئی سروکار نہیں لیکن یہ رسالہ راستی کا راستہ دکھاتا ہے اس لئے اسی قدر لکھتا ہوں۔ انکے شاگردوں

میں بعض کی غزلیں گلدستۂ رحمتی میں شایع ہوئی تھیں۔ ان کے ایک شاگرد مولوی عبدالغفور دقیق کی ایک تحریر موجود ہے جس میں انھوں نے فخر کے ساتھ شاہ کے واسطے سے اپنی شاعری کا سلسلہ غالب تک پہونچا بیان کیا ہے۔ افسوس ہے شاہ کا کلام اب نایاب ہے۔ اخیر عمر میں انھوں نے اپنے شاگرد عبدالکریم کو حکم دیا کہ ساری بیاض کو لیجاکر گنگا میں ڈبو دو۔ نشتر مرحوم کہتے تھے کہ میں نے ان کے حکم کے بموجب سارا کلام گنگا میں ڈبو دیا۔ راقم کو شاہ کے چند اشعار جو یاد رہ گئے ہیں یہ ہیں:۔

کچھ ایسے واقعات مرے دل کے ساتھ ہیں ۔۔۔ جیتے تو ہیں مگر بڑی مشکل کے ساتھ ہیں

مایل حسن پرستی ہے طبیعت اپنی ۔۔۔ خلق میں عشق بتاں سے ہوئی خلقت اپنی

دل پہ قابو نہیں بے بس ہیں علی انور شاہ ۔۔۔ آہی جاتی ہے حسینوں پہ طبیعت اپنی

غالب کا سن وفات تو تذکروں میں پایا جاتا ہے لیکن دن اور مہینے کی تاریخ اہل تذکرہ نے کمتر لکھی ہے غالب کے مرنے پر صوبۂ بہار کے کئی شاعروں نے تاریخیں لکھیں ان میں ایک تاریخ شاہ یحیٰی صاحب کی کہی ہوئی راقم کے پاس موجود ہے یوں ہے "قطعہ تاریخ وفات نواب نجم الدولہ دبیرالملک اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ واقعہ دویم ذیقعد روز دوشنبہ ۱۲۸۵ھ" اس کے بعد قطعہ ہے جس کا آخری شعر یہ ہے:۔

سال آں بے نظیر یحیٰی ۔۔۔ گو، بود نظیری زمانہ

صوبۂ بہار میں جہاں غالب کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی وہیں اُن کا سب سے بڑا مخالف بھی پیدا ہوا، یعنی مرزا واجد حسین صاحب یاس عظیم آبادی معروف بہ یگانہ چنگیزی لکھنوی۔ یہ راقم کے منجھلے بھائی مولوی عزیزالدین بلخی راز مرحوم مولف تاریخ شعرائے بہار کے دوستوں میں ہیں جس کا ذکر مرزا صاحب نے اپنی مطبوعہ نظم میں بھی کیا ہے۔ مرزا صاحب کی تصنیف غالب شکن کا نتیجہ بظاہر ان کے منشا کے برعکس ہوا۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ مرزا صاحب نے دانستہ یا نادانستہ غالب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور اپنی تحریر میں غالب کی شاعری سے زیادہ اس کے کیرکٹر پر حملے کئے ہیں۔

فصیح الدین بلخی

من ویزداں

کے متعلق اکثر حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ جلدوں میں شایع ہوئی ہے، حالانکہ وہ ایک ہی جلد میں تمام ہوگئی ہے۔

مذہبی استفسارات وجواب کا مجموعہ بالکل دوسری چیز ہے اور من ویزداں کے کسی مضمون کا تعلق اس سے نہیں ہے اسی طرح مذہب بھی ایک علٰحدہ کتاب ہے لیکن مناسب یہی ہے کہ مذہب کے موضوع پر ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے من ویزداں کا دوسرا اڈیشن زیر طبع ہے اور جون تک غالباً شایع ہوجائے گا۔

منیجر نگار

پاکستان کے لئے ہمارے ایجنٹوں کے پتے نوٹ کر لیجئے

۱۔ ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی۔ ۲۲۲، الٰہی بخش کالونی کراچی

۲۔ ملک دین محمد اینڈ سنز بل روڈ لاہور

آپ ان کو سالانہ چندہ بھیج کر نگار کے خریدار ہوسکتے ہیں اور کتابوں کی قیمت بھیج کر وہ بھی ہم سے حاصل کرسکتے ہیں۔

منیجر نگار

اذاجاءت الساعۃ وانشق القمر

اس وقت جنگ و مدافعت دونوں نے ایسی علمی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ جب تک پہلے سے اس کے نقشے نہ طیار کرلئے جائیں اور جملہ تفصیلات و امکانات ضبط تحریر میں نہ لے آئے جائیں کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا اور یہ احتیاط اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ اگر کوئی مفروضہ خطرہ یا "اندیشۂ دور و دراز" بھی سامنے ہوتا ہے تو اس کو حقیقت و واقعہ فرض کرکے دفاعی تدبیریں شروع ہوجاتی ہیں اور اس کے متعلق نقشے اور چارٹ وغیرہ طیار ہونے لگتے ہیں۔

اس قسم کی پیش بندیوں میں غالباً سب سے زیادہ عجیب و غریب پیش بندی وہ ہے جو ویانا کے ایک انجنیر "Hans Hoerbiger" نے کی ہے۔ اس نے مدافعت و تحفظ کا پورا پروگرام مرتب کرکے اس کے نقشے وغیرہ بھی پہلے ہی سے طیار کرلئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ضرورت کے وقت کرۂ ارض سے دوسرے سیاروں تک انسان کیونکر سفر کرسکے گا، آتشی راکٹوں کے ذریعہ سے وہ کس طرح لاکھوں ٹن وزن کا تباہ کن مادہ فضا میں منتشر کرسکے گا، پانی، آگ اور زلزلہ سے بچنے کے لئے سر بفلک پہاڑوں کی مضبوط چٹانوں کے اندر کس قسم کی پناہ گاہیں طیار کرنا پڑیں گی۔ لیکن آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ یہ اس نے کس دشمن سے بچنے کے لئے سوچا ہے؟ — چاند — وہی چاند جو ہمیں ٹھنڈک پہونچاتا ہے، لطیف و خنک روشنی مہیا کرتا ہے اور جس کے دم سے ہمارے محافل شعر و نغمہ زندہ ہیں۔

اس انجنیر کا خیال ہے کہ کرۂ زمین کے لئے سب سے بڑا خطرہ چاند ہے اور اس کا احساس سب سے پہلے اسے ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ گو زمین کی کشش سے چاند اس کی چاروں طرف طواف کر رہا ہے، لیکن چونکہ وہ اپنی جگہ خود بھی گردش میں ہے اس لئے وہ آہستہ آہستہ زمین سے قریب ہوتا جارہا ہے اور اگر اس نے اپنی رفتار نہ بدلی تو تصادم ضروری ہے۔ اس لئے اس خطرہ سے بچنے کے لئے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ کس رفتار سے آگے بڑھتا آرہا ہے۔

اس وقت تک زمین پر رہ کر جو اندازہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کم از کم ۵ ہزار سال تک تو اس تصادم کا اندیشہ نہیں لیکن یقین کے ساتھ اسی وقت کو کہا جاسکتا ہے جب چاند کی سطح پر پہونچکر اس کا اندازہ کیا جائے یا فضا میں موسم کی جانچ کرنے والے اسٹیشن قایم کرکے آلات و تصاویر سے صحیح پوزیشن معلوم کی جائے پھر اگر اس تحقیقات سے یہ ثابت ہو کہ چاند خطرناک طور پر زمین کی طرف بڑھتا آرہا ہے، تو ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہم اس خطرہ سے کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو قبل اس کے کہ چاند زمین سے ٹکرائے ہم چاند ہی کو فنا کردیں، یا یہ کہ اسے پیچھے ڈھکیل دیں۔

چاند کو فنا یا ریزہ ریزہ کرنے کے سلسلہ میں ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس کے لئے کم از کم سات ارب آتشی بموں کی قوت اور دس لاکھ سال کی فرصت درکار ہوگی اس لئے چاند کو فنا کردینے کا خیال تو ناقابلِ عمل ہے۔ اب رہا چاند کو پیچھے ہٹا دینا سو اس کے لئے ہم کو بڑے بڑے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے آتشی راکٹ چاند کی طرف سر کرنے ہوں گے اور اگر اس طرح ہم چاند کو پانچ ہزار میل بھی پیچھے ڈھکیل سکے تو کم از کم ایک ہزار سال کے لئے ہم اس خطرہ کی طرف سے مطمئن ہوجائیں گے۔

لیکن اگر ہم اس میں کامیاب نہ ہوں تو پھر اس کے بعد یہ سوچنا ہوگا کہ اگر چاند ہم سے بہت قریب آگیا تو ہم تباہی سے

کیونکر بچ سکتے ہیں، اور ہمارا طریق مدافعت کیا ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اگر چاند، زمین کے قریب آگیا تو ہوگا کیا؟۔ ہم اسے تصادم تو کہہ نہیں سکتے کیونکہ کُرے ایک دوسرے سے ٹکرا نہیں سکتے، لیکن وہ اپنی قوت وکشش سے ایک دوسرے کو برباد و مسمار ضرور کرسکتے ہیں۔ جس وقت چاند زمین سے اس قدر قریب آئے گا کہ اس کو پارہ پارہ ہوجانا چاہئے، تو اس خطرہ کا علم ہم کو سب سے پہلے اس طرح ہوگا کہ مدو جزر میں فرق پڑ جائے گا، اور سمندروں کا پانی خط استواء (Equator) سے ہٹ کر قطبین کی طرف سمٹے گا اس طرح بحر اٹلانٹک خشک ہونے لگے گا اور اس کا پانی آس پاس کے نشیبی حصوں میں پھیل جائے گا۔ اسی کے ساتھ چاند کی رفتار گردش زمین کے گرد کم ہوجائے گی اور ۲۸ دن کی جگہ ۳۰ دن، ۴۰ دن، ۵۰ دن اور اسی طرح رفتہ رفتہ زیادہ دن اپنی گردش پوری کرنے کے لئے درکار ہوں گے یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب وہ ایک جگہ قایم ہوکر رہ جائے گا اور زمین کے گرد گردش کرنے کے بجائے وہ زمین کے ساتھ ساتھ گھومنے لگے گا۔ بظاہر اس میں کوئی حرج نہیں نظر آتا، لیکن در اصل یہ حادثہ زمین کے لئے قیامت کا حادثہ ہوگا کیونکہ جب چاند ہمارے سروں پر آکر ایک جگہ قایم ہوجائے گا (اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ جگہ سیلون کا خط طول البلد یا اس کے مشرق میں واقع ہوگی) تو زمین کا وہ حصہ جو اس کے مقابل ہوگا دفعتاً اُبھرنا شروع ہوگا، آتش فشاں پہاڑ پھوٹ پڑیں گے اور زلزلے کے جھٹکے پے درپے محسوس ہونے لگیں گے، اس کے ساتھ ہی چاند کی برفیلی سطح ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہوگی اور چونکہ چاند کا اکثر حصہ یخ کی طرح منجمد ہے، اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی ان برفیلی چٹانوں سے زمین پر ۲۰ میل کی موٹی تہ چڑھ جائیگی اور یہاں کی تمام عمارتیں چور چور ہوکر برف کے نیچے دب جائیں گی۔

اسی کے ساتھ چونکہ چاند کی کشش ختم ہوجائے گی اس لئے منطقۂ حارّہ (Tropics) کا پانی منطقۂ معتدلہ (Temperate) میں منتقل ہوکر وہاں سیلاب کی سی کیفیت پیدا کردے گا۔ اس کے بعد جب چاند کا اندرونی پگھلا ہوا حصہ باہر نکلنا شروع ہوگا تو وہ زمین پر اس طرح گرے گا جیسے بموں کی بارش ہورہی ہو۔ اسی کے ساتھ پہاڑوں کی آتش فشانی، زبردست زلزلوں کے جھٹکے، نہایت گرم و تیز آندھیاں اور سیلاب وغیرہ کی مصیبتوں سے واسطہ پڑے گا اور سوا ان چند نفوس کے جنھوں نے بلند پہاڑوں کے غاروں میں پناہ لےلی ہوگی تمام آبادی ختم ہوچکی ہوگی۔ اب زمین ایک ایسا کرہ نظر آئے گی جہاں کے سمندر ٹھہرے ہوئے ہیں اور مدو جزر سے بے نیاز، موسموں کا تغیر ختم ہوگیا ہے۔ قطبین نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے اور زمین کا محور یا دُھرا عمودی ہوکر رہ گیا ہے، چاند کے ملبے سے زمین چاروں طرف ڈھکی ہوئی ہے، کرۂ زمین کا شمالی حصہ بالکل برف پوش ہے اور جنوبی حصہ میں سمندر ہی سمندر نظر آرہا ہے۔

پھر اس وقت جو چند نفوس باقی رہ گئے ہیں وہ پہاڑوں کے غاروں سے نکلیں گے اور دنیا کو پھر از سرِ نو بسانے کی کوشش کریں گے، لیکن وہ اس میں کامیاب ہوں گے یا ناکام اسے کون جان سکتا ہے۔

دیاتا کے اس انجینیر نے صرف ان خطروں ہی کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اس سے بچنے کی بھی ایک اسکیم پیش کی ہے اور وہ یہ ہے کہ دس ہزار فٹ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ گاہیں بنائی جائیں جو ہمالیہ سے شمال یا شمال مغرب کی طرف دو ہزار میل دور ہوں۔ اس غرض کے لئے اس نے ہمالیہ کا وہ حصہ جو جنوبی تبت سے قفقاز تک چلا گیا ہے، بہت موزوں بتایا ہے اور اس کے بعد مغربی چین، جزایر ہوائی، فارموسا اور جنوبی افریقہ کا ذکر کیا ہے۔

یہ پناہ گاہیں اس کی رائے میں اتنی وسیع ہونی چاہئے کہ آدمیوں کے ساتھ گھریلو جانوروں کو بھی ان میں جگہ مل سکے تاکہ جب انسان دوبارہ اس تباہ شدہ کرۂ زمین کو بسائے تو ان جانوروں سے مدد لے سکے۔

سلامِ عقیدت

سلام، اے فطرتِ کون و مکاں کے جوہرِ اعظم سلام اے مطلعِ انسانیت کے نیرِّ اعظم
سلام اے مرشدِ کامل، سلام اے رہبرِ اعظم

سلام اے کاکلِ فطرت کی گرہیں کھولنے والے ترازوئے عمل پر زندگی کو تولنے والے
مشیئت کے لبِ معجز اثر سے بولنے والے

سلام اے وقت کی رفتارِ کج کو موڑنے والے طلسمِ ظلمت آبادِ جہالت توڑنے والے
خدا کی ذات سے بندوں کا رشتہ جوڑنے والے

تری چشمِ حقیقت بیں امینِ رازِ یزدانی، ترے افکار، سوزِ سینۂ تقدیرِ انسانی
ترے جذبات، آب و گل کی اک معراجِ روحانی

تپش نے تیری لہکا زندگی کے دل کا انگارا تری ٹھوکر سے ریگستان میں تہذیب کا دھارا
ترا سینہ مشیئت کی تمناؤں کا گہوارا

حرا کے غار میں روشن کیا ایسا دیا تونے کہ جس کی روشنی سے دہر کو چمکا دیا تونے
مئے وحدت کا ساغر چار سو چھلکا دیا تونے

بدل دی اک اشارے میں زمانے کی ہوا تونے بیابانِ عرب کو مرجعِ عالم کیا تونے
شتربانوں کو عرفانِ جہانبانی دیا تونے

محبت کے تلوّن کو جنوں کی پختگی بخشی، عمل کی روح کو اپنے جگر کی تازگی بخشی
چراغِ آدمیت کو نئی تابندگی بخشی

عروسِ زندگی کو فکر کا زیور دیا تونے تقاضائے دلِ فطرت کو پورا کر دیا تونے
خودی کی مئے سے جامِ روحِ انساں بھر دیا تونے

مزاجِ سنگ و آہن کو بنایا معتدل تونے مٹا کر قیصریت کا نظامِ مضمحل تونے
دیا انسانیت کو اک پیامِ مستقل تونے

ترا نورِ ہدایت آفتابِ صبحِ بیداری ترا پیغام دنیا میں صداقت کی علمداری
اخوت کا جہاں سازی محبت کی فسوں کاری

ترے در کی گدائی نے عطا کی فقر کو میری ترے اعجاز سے پائی محبت نے جہانگیری
ترے صدقے میں دنیا کو ملا کردارِ شبیری

مبارک ذہنِ انساں میں حیاتِ جاوداں تجھکو زمانہ کہہ رہا ہے رہبرِ کون و مکاں تجھکو
دعا دیتا ہے ہر ہر موڑ پر یہ کارواں تجھکو

رضا نقوی

طوفان

وہ دیکھو گرد آلودہ ہوئے ماتھے ستاروں کے
سمن زاروں میں خیمے جل اُٹھے رنگیں بہاروں کے
وہ جاگے زلزلے، فطرت کے ماتھے پر شکن آئی
جبینِ خورشید کی وہ آہنِ ظلمت سے ٹکرائی
بجھے تارے، دریدہ ہوگئے آنچل گھٹاؤں کے
وہ سجدے تھک کے لوٹے، سلسلے ٹوٹے دعاؤں کے
اندھیرے کے کفن پھیلے، وہ دم توڑا چراغوں نے
جہالت کی ردائیں اوڑھ لیں بڑھ کر دماغوں نے
وہ خبث و مکر دوڑے طاعت و عرفاں کے جادوں پر
لگادی معصیت نے مُہر فطرت کے ارادوں پر
وہ ہر رہبر نے لوٹا جادۂ ہستی کے راہی کو
وہ ہر معمار نے آواز دی ہنس کر تباہی کو
وہ ہر مطرب نے سازِ امن چھیڑا جبر کی دُھن میں
درندہ بن گیا انسان آغوشِ تمدن میں
وہ بھیگیں خون سے شعر و ادب کی آستینیں بھی
جھکادیں وقت نے کانٹوں پہ پھولوں کی جبینیں بھی
وہ بھڑکے جبر و استبداد کے شعلے کنشتوں میں
نظر آنے لگے دوزخ کے انگارے بہشتوں میں
وہ لوٹا آدمیت کو سیاست کے لٹیروں نے
وہ نجم و کہکشاں کو ڈس لیا بڑھکر اندھیروں نے

ہوا و سیل کی حد میں یہ دنیا آنے والی ہے
کسی طوفان کی زد میں یہ دنیا آنے والی ہے

وہ دیکھو آگیا طوفاں وہ دیکھو آگئی آندھی
سفینوں کے سواروں نے ابھی ہمت نہیں باندھی
ابھی نیندوں کی مہریں ہیں ابھی ملّاح سوتے ہیں
نہ جانے ناخدا کب خواب سے بیدار ہوتے ہیں
سمندر کی جبیں پر اب ہوا کے نقش گہرے ہیں
وہ دیکھو کشتیوں پر ہر طرف طوفاں کے پہرے ہیں
تلاطم بڑھتا جاتا ہے ہوائیں تیز ہوتی ہیں
سفینوں کی جبینیں آج سجدہ ریز ہوتی ہیں
اگر ملّاح جاگیں ناخدا ہشیار ہو جائیں
ہوا و سیل کے حاکم اگر بیدار ہو جائیں
سفینے کھینے والوں کو اگر اک جوش آجائے
اگر ان نیند کے ماتوں کو اب بھی ہوش آجائے
اگر اک عزم راسخ ان کو پیغمبر نگاہی دے
اگر ان کی صلابت ان کی عظمت کی گواہی دے
اگر یہ نوح کے بیٹے خود اک طوفان بن جائیں
ہوا و برق ابر و سیل کے سلطان بن جائیں

قدم رکھ دیں اگر بڑھ کر یہ طوفانوں کے سینوں پر
چمک اُٹھیں نبوت کے نشاں ان کی جبینوں پر

ساقی جاوید

فضا ابنِ فیض اعظمی :-

یہ دھندلکے یہ اندھیرے کا سفر اے ساقی!
گم ہوا قافلۂ صبح کدھر اے ساقی!

شب کے گہوارے میں بے چین ہیں مہتاب و نجوم
روشنی ڈھونڈھتی ہے راہِ سفر اے ساقی!

جُرم میں تیرہ شبی کے ہیں اُجالے محبوس
دست و پا بستہ ہے مظلوم سحر اے ساقی!

جس نے سورج کو سکھایا تھا چمکنے کا ہنر
اب وہ ظلمات سے ٹکراتا ہے سر اے ساقی!

ہر گلِ لالہ ہے اوڑھے ہوئے زخموں کی نقاب
عشوۂ خاک ہے تکلیفِ نظر اے ساقی!

شعلہ آمیز یہ شبنم، یہ سلگتے بادل
خیمۂ گل پہ برستے ہیں شرر اے ساقی!

نہ رہا بادۂ شیراز کے قابل کوئی ظرف
پھیر لی ساغر و مینا نے نظر اے ساقی!

ہو گیا مہرِ مبیں ذرے کے سینے میں غروب
ریگ میں جذب ہوا آبِ گہر اے ساقی!

دیجے ہر موڑ پہ جبریل و خضر کو آواز
بجھ گئی شمعِ سرِ راہ گزر اے ساقی!

کس طرح ہو گئے ناپید صنادیدِ عجم
اف! یہ تاریخ و سیاست کے بھنور اے ساقی!

یہ در و بام یہ ایوانِ تباہی عنوان
خون ہو جائے گا ہیرے کا جگر اے ساقی!

بھوک اور پیاس کے انداز پہ ہنستی ہی رہی
زینتِ افسر و اورنگ و کمر اے ساقی!

کون پوچھے زر و دولت کے خداؤں کا مزاج
اپنے افلاس سے خیرہ ہے نظر اے ساقی!

اب بھی واضح نہیں ادراک و بصیرت کے نقوش
سرد ہے آج بھی بازارِ ہنر اے ساقی!

باطل اندیشہ نبی — راہ غلط کردہ رسول
راہ بر کوئی نہیں، جائیں کدھر اے ساقی!

چھوڑ کر کنج میں ادبار و ملامت کے ہمیں
مڑ گئی گردشِ ایام کدھر اے ساقی!

جمیل مظہری :-

مجھ سے ممکن نہ ہوا تیرے تبسم کا جواب
ہنس دیا زخم جگر میری ہنسی پر اے دوست

بات یہ ہے کہ ستم میں تھی جبھی تک لذت
جب تلک تیرا کرم تھا نہ کسی پر اے دوست

ہو مبارک تیرے گیسوئے رسا کا سایہ
عشق اور عشق کی آشفتہ سری پر اے دوست

میرا جذبہ تو یہ کہتا ہے کہ قربان کر دوں
سو نگاہیں تیری اک کم نگہی پر اے دوست

باغباں کچھ کہے لیکن نگہِ بلبل کا
قرض ہے باغ کی ایک ایک کلی پر اے دوست

ہم نے ظلمت کو بھی سمجھا ترے چہرے کی نقاب
اک تبسم میری اس خوش نظری پر اے دوست

عشق اک تشنہ لبی ہے بہ نظر گاہِ مجاز
حسن اک طنز ہے اُس تشنہ لبی پر اے دوست

ایک وارفتۂ صحرائے تحیر ہے جمیل
اور ترا لطف تبسم ہے اسی پر اے دوست!

جگر بریلوی :-

شعلۂ حسن بھڑکنے لگا اب دل کے قریب
گرمیِ شوق ہے یا آگئے منزل کے قریب

روشن آنکھیں ہوئی جاتی ہیں تو دل محو نشاط
لے ہی آئی ہمیں وحشت تیری محفل کے قریب

شوق نے بڑھ کے رگ و پے میں عجب حال کیا
پاؤں اُٹھتے نہیں آکر تری محفل کے قریب

پھٹنے لگتا ہے عجب جوشِ طرب سے سینہ
مسکراتا ہوا آتا ہے جو وہ دل کے قریب

نیند آنکھوں میں ہے یا کیف ہم آغوشی ہے
جیسے محبوب کا دل اب ہے مرے دل کے قریب

دل اُچھلتا ہے کہ ہوتا ہے جگر بیڑا پار
شاید آپہونچا سفینہ مرا ساحل کے قریب

وحید اختر:۔

تسکینِ ذوقِ دید کا ساماں نہ کر سکے / جو جلوے پائے شوق کو جولاں نہ کر سکے
جب بھی بہار آئی فقط مسکرا پڑے / کیوں پھول اعتبارِ بہاراں نہ کر سکے
شاید انھیں سے نورِ سحر کا ملے سراغ، / وہ ظلمتیں کہ جن کو فروزاں نہ کر سکے
کردی غموں نے اور بھی مربوط داستاں، / شیرازۂ حیات پریشاں نہ کر سکے

شمیم نعمانی:۔

جو دل پہ گزرتی ہے بہاروں سے نہ کہنا / اب پھول بھی چبھ جاتے ہیں خاروں سے نہ کہنا
امسال خزاں میں بھی کئی پھول کھلے تھے / موقع بھی اگر ہو تو بہاروں سے نہ کہنا

دلوں کی آگ بھی ہے وہ بلائے بد کہ جسے / لگانے والا بھی اکثر بجھا نہیں سکتا
تھا زندگی میں جبرِ مسلسل عزیز تر / ناگاہ اختیار کے دھوکے میں آگئے

ہم ہی نہیں ہیں وقفِ الم اور بھی تو ہیں / منت گزارِ طرزِ ستم اور بھی تو ہیں
ہم نے تو خیر دردِ محبت کو پا لیا / لیکن خرابِ دیر و حرم اور بھی تو ہیں
اک ہم ہی نامرادِ محبت نہیں شمیم / مانوسِ اعتبارِ کرم اور بھی تو ہیں

اندازِ بیاں لاکھوں ہیں افسانہ وہی ہے / ذرّے ہیں وہی جلوۂ جاناں نہ وہی ہے
ہر بار بدل دیتا ہوں دامانِ تمنا، / لیکن مرا اندازِ گدایانہ وہی ہے

رفتہ رفتہ زندگی کو راہ پر لانے لگے / غم پہ غم کھائے نہ جاتے تھے مگر کھانے لگے
ہوگئے غنچے پریشاں، پھول کملانے لگے / میرا افسانہ چمن والے بھی دہرانے لگے

للہ چراغِ حرم و دیر بجھا دو / ہم بزمِ محبت سے کہیں جا نہ سکیں گے
دل تابِ ہوا خواہیِ غم لا نہ سکے گا / ہم تابِ جگر داریِ دل لا نہ سکیں گے

آئینِ التفاتِ غمِ یار دیکھنا / دنیا میں آج کوئی ہمارا نہیں رہا
اندازِ دلفریبیِ طوفاں تو دیکھئے / دریا میں ڈوبتے ہی کنارا نہیں رہا

شفیق جونپوری:-

بیگانگی پہ تیری جفا کا گماں نہ تھا
انجام عشق سوچ چکے تو مہرباں نہ تھا

ہر سادگی کو آمدِ محشر کا انتظار،
نامِ خدا وہ دور کہ جب تو جواں نہ تھا

راضی تھا جس قدر کہ جفاؤں سے تری دل
اتنا کسی کے لطف سے بھی شادماں نہ تھا

وہ شیوۂ رضا طلبی یاد ہے تجھے
تیرا عتاب بھی مرے دل پر گراں نہ تھا

جب یاد آگیا تو نشاط آفریں ہوا
وہ لمحۂ فراق جو راحت رساں نہ تھا

گزری ہے تیرے غم میں جوانی شفیق کی
وہ موسمِ بہار میں بھی بے خزاں نہ تھا

انور دہلوی (از کراچی)

فرصت کے لمحے ہم کو زمانے نے جو دئے　　　ہم نے وہ یادِ عشرتِ ماضی میں کھو دئے
میری تباہیوں پہ تبسم بھی تھا حرام　　　رسوائی کا خیال جو آیا تو رو دئے
اک موجۂ امید نے دیکر فریبِ امن　　　ساحل پہ لا کے لاکھوں سفینے ڈبو دئے

انور ہمارے حالِ خراب و تباہ پر
آج اُن سے بھی رہا نہ گیا وہ بھی رو دئے

رئیس امروہوی :-

گو سبھی مشق ستم سے آزمائے جائیں گے
وائے اُن پر جو کرم سے آزمائے جائیں گے

سلسلہ جنباں ہوئے وحشت کے ہنگامے ترے
اُن کی زلفِ خم بخم سے آزمائے جائیں گے

کفر مطلق ! بندگانِ خاص تیرے تاکجا
فتنۂ دیر و حرم سے آزمائے جائیں گے

خضر ہمت کی منادی ہے کہ راہِ شوق میں
راہرو پہلے قدم سے آزمائے جائیں گے

امتحانِ سعیِ ضبط غم میں ہم تنہا نہیں
وہ بھی سعیِ ضبط غم سے آزمائے جائیں گے

اُن کو دعوے ہیں بہت بندہ نوازی کے رئیس
آزمائیں گے جو ہم سے آزمائے جائیں گے

رضا نقوی :-

فقط یہ پرسشِ غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
کرم تمھارا، کرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

شکستِ شیشۂ دل نے یہ دی صدا، کہ حیات
سرورِ ساغرِ جم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مٹا رہی ہے جسے کارواں کی تیز روی
وہ صرف، نقشِ قدم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

یہ بات اہلِ حرم کاش کے سمجھ سکتے
صنم کدے میں صنم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

سمجھ سکو تو مری ان اداس نظروں میں
فسانۂ شبِ غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ہوائیں لانے لگی ہیں پیامِ وقت رضاؔ
حیات، موسمِ غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

افتخار اعظمی انور :-

دل ہے شادابِ مسرت، جاں ہے سیرابِ نشاط
چشم تر سے یوں رواں ہے آبشارِ آرزو

پھر وہی موج تبسم پھر وہی نورِ جمال،
روئے رنگیں پر کوئی دیکھے بہارِ آرزو

یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ بہارِ رنگ و بو
آکنارِ شوق میں آ، اے نگارِ آرزو

جگمگا اٹھیں فضائیں کثرتِ انوار سے
یوں اٹھا رخ سے نقاب اے نوبہارِ آرزو

مطبوعات موصولہ

بکھری کرنیں مجموعہ ہے جناب پنڈت کشن پرشاد کول کے پانچ افسانوں کا جسے نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔
جناب کول ایک کہنہ مشق ادیب ہیں اور ہرچند یہ ضروری نہیں کہ ہر ادیب فسانہ نگار بھی ہو، لیکن کول صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو ادبیات کے سلسلہ میں شاعر کے سوا سب کچھ ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

اس مجموعہ کا پہلا افسانہ "دیپک اور پتنگ" اس سے پہلے کسی رسالہ میں شایع نہیں ہوا اور غالباً یہی ایک فسانہ ایسا ہے جس کا تعلق کسی خاص سانحہ یا واقعہ سے نہیں ہے باقی چار افسانوں کا پس منظر بڑی حد تک "واقعاتی" ہے جسکا اظہار انھوں نے اپنے پیش لفظ میں بھی کر دیا ہے — کول صاحب پیش لفظ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"ایک زمانہ تھا کہ رومان نگاری اور عبارت آرائی ادب کی جان سمجھی جاتی تھی — آج افسانوی ادب میں "زندگی، زندگی" کی ایسی پکار مچ رہی ہے کہ جب تک کوئی فسانہ کسی خاص "اِزم" سوشلزم، کمیونزم، یا فرائڈازم کے رنگ میں رنگا ہوا نہ ہو قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا اور ادبیت کی معمولی چاشنی بھی ہنر نہیں بلکہ عیب سمجھی جاتی ہے اور ہمارا آجکل کا فسانوی ادب ادبیت سے دور اور صحافت سے قریب تر ہو گیا ہے ان دونوں انتہا پسند طرزوں سے ان افسانوں کا دامن بچایا گیا ہے۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ کول صاحب کی یہ تنقید ان افسانوں کے متعلق بڑی حد تک صحیح ہے اور اسی تنقید کی روشنی میں انھیں اس مجموعہ کو دیکھنا چاہئے۔

کول صاحب کی عمر کا بڑا حصّہ اور شاید عالمِ شباب میں بھی یہیں لکھنؤ میں بسر ہوا ہے لیکن ان افسانوں کے تاثرات یکسر غیر لکھنوی ہیں۔ کاش کہ اس مجموعہ میں کوئی ایسی چیز بھی ہوتی جسے ہم کول صاحب کی "آپ بیتی" سمجھ کر پڑھتے اور اُس عہدِ شباب کا ماتم کر سکتے جسے کول صاحب نے نہیں تو ان کے بعض احباب نے ضرور یہاں کی گلیوں میں کھویا ہوگا۔

کول صاحب ادب میں "ازمیات" کے مخالف ہیں، لیکن وہ خود ان افسانوں میں conventionalism سے نہیں بچ سکے۔

مقننہ اور قانون سازی تالیف ہے جناب عبدالحفیظ صدیقی بی اس سی، ال ال ام کی جس میں انھوں نے تقابلی مطالعہ کے بعد ہند کے موجودہ دستور سے بحث کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی ملک کے دستور یا آئین کا صحیح مطالعہ، صحیح ذوق کے ساتھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سیاست یا قانون سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن چونکہ عوام کو بھی اپنے فرایض و حقوق جاننا ضروری ہیں۔ اس لئے کوئی ایسی کتاب جو ان باتوں کو غیر قانونی سادہ زبان میں ہم کو سمجھا سکے، یقیناً قابل قدر ہے۔

اس کتاب کے فاضل مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ ہندوستان کے آئین و دستور کو زیادہ قریب الفہم بنا سکیں اور اس لئے امید کی جاتی ہے کہ ان یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی — ضخامت ۲۸۴ صفحات۔ کتابت، طباعت غنیمت۔ قیمت چار روپیہ (جو یقیناً زیادہ ہے) ملنے کا پتہ :- اُردو کتاب گھر، چار کمان، حیدر آباد دکن۔

امن کا کارواں اپریل ۵۲ء میں کل ہند امن کانفرنس کا اجتماع کلکتہ میں ہوا تھا۔ محترمہ رضیہ سجاد ظہیر بھی جو ترقی پسند جماعت سے بڑا اہم تعلق رکھتی ہیں، اس میں شریک ہوئی تھیں۔ انھوں نے اس کتاب میں اسی

کانفرنس کی کارروائی پیش کی ہے، لیکن ایک ایسے دلچسپ انداز میں کہ وہ کانفرنس کی روداد تو کیا بالکل "رودادِ دل" ہو کر رہ گئی ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر، اس وقت کی خواتین میں، بہت مشہور فسانہ نگار ہیں اور یہ شہرت انھوں نے غلط حاصل نہیں کی لیکن کسی کانفرنس کی کارروائی کو فسانہ بنا دینا یقیناً فسانہ نگاری سے زیادہ کچھ اور چیز ہے جسے نہ ہم تصنیف کہہ سکتے ہیں نہ تصحیف۔

یہ کانفرنس بجائے خود کیا تھی اور اس نے اس اجتماع میں کیا کام کیا۔ اس کی جستجو غالباً بے محل ہے، کیونکہ اس کتاب کی اشاعت سے غالباً خود رضیہ سجاد ظہیر کا بھی مقصود یہ نہ تھا کہ اس حیثیت سے لوگ اس کا مطالعہ کریں، ورنہ وہ اسے اس انداز سے کیوں پیش کرتیں کہ پڑھنے والے کانفرنس کے بجائے خود انھیں کو دیکھنے لگیں۔

ضخامت ۹۶ صفحات، طباعت، کتابت وغیرہ معمولی۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اُردو کتاب گھر گورکھپور۔

نقدِ اقبال

تصنیف ہے جناب میکش اکبر آبادی کی، جس میں انھوں نے اقبال کے نظریۂ تفلسف و تصوف سے بحث کی ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ بحث بڑی منصفانہ ہے۔

اس کتاب میں مسئلہ وحدت الوجود، افلاطونیت جدید، ویدانت، نظریۂ ابن عربی، افلاطون کے اعیانِ ثابتہ وغیرہ سب کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ اقبال کس چیز سے کس حد تک متاثر ہوئے اور ان کے کلام میں نظریاتی حیثیت سے جو اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اس کے اسباب کیا ہیں۔

اقبال پر اس وقت تک متعدد کتابیں شایع ہو چکی ہیں، لیکن اپنے مخصوص موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتی ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب و تصنیف محض معتقدانہ شیفتگی کا نہیں بلکہ صحیح ذوقِ نقد و جستجو کا نتیجہ ہے جس میں اس نشیب و فراز کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جہاں اقبال نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔۔ کتاب کی طباعت و کتابت بہت اچھی ہے اور تین روپیہ میں خود مصنف سے میوہ کٹرہ آگرہ کے پتہ پر مل سکتی ہے

جیبی فارماکوپیا

انسان کی صحت زندگی کا اہم ترین مسئلہ ہے اور بدقسمتی سے اسی پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ بقاء صحت کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ طبّی امداد ہم کو آسانی کے ساتھ ہر وقت روز ایسال سکے بلکہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہر شخص خود بھی اصولِ صحت سے واقف ہو اور ایک حد تک مرض کو سمجھ خود دفع مرض کی تدابیر کر سکے۔

مغرب کی زبانوں میں تو ایسی کتابیں بہت ہیں جو "فیملی ڈاکٹر" کا کام دیتی ہیں لیکن اُردو میں بہت کم ہیں۔ ہمارے عزیز دوست حکیم اقبال حسن صاحب لاہوری نے اسی ضرورت کے پیشِ نظر یہ کتاب شایع کی ہے۔ اس میں مصنف نے تمام امراض کے نہایت آسان و ارزاں نسخے یکجا کر دئے ہیں جو خود ان کے خاندان کے تجربہ میں آچکے ہیں۔ اس میں ایک باب کشتہ جات کا بھی ہے اور دوسرا علاج بالغذا کا بھی۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب ہر گھر میں رہے تاکہ وقت ضرورت معمولی معمولی امراض کا علاج خود کر سکے اور ڈاکٹری علاج کے غیر معمولی مصارف سے بچ سکے۔ یہ کتاب پانچ روپیہ میں دفتر رسالہ "اسرارِ حکمت" داتا گنج بخش روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

تحفۂ احسن

مرحوم مولانا احسن مارہروی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے بچوں کے لئے بعض کہاوتوں اور مثلوں کو منظوم صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک سو سے زیادہ ضرب الامثال پائی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے اکثر اس طرح نظم کی گئی ہیں کہ تکلف و تصنع کا پتہ نہیں چلتا، لیکن بعض امثال کے نظم کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہوئے یہاں تک کہ کہیں کہیں مصرعے وزن سے بھی خارج ہو گئے ہیں۔ ایسی نظموں کو شایع نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ:۔ کاشانۂ اُردو۔ ۱۸۸۔بی۔ پاکستان ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی۔

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاستِ بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشاء میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے قیمت ہر حصّہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخییل، اسکی نزاکتِ بیان اسکی بلندیِ مضمون اور اس کی انشاءِ عالیہ سحرِ حلال کے درجہ تک پہونچی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں بھی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوانِ شباب کا لکھا ہوا افسانہ حُسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو رتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکراتِ نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقیدِ عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اسکو شروع کردینا آخر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا ترجمہ شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اُردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد فنون ادبیہ و حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

REGD No. A486

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ سنہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جسمیں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و اقتصادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈس کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور انکے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں سالنامہ کا دوسرا حصہ ڈاکٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اسکو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے دو

سالنامہ سنہ ۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر معتدادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کیلئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے، انکا نبرکا قیام رامپور، قیام حیدرآباد زمانہ کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور انکے فن شعرگوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت دو روپیہ